وہ بھی کیا دن تھے

حکیم محمد سعید کے بچپن کی یادیں



مکتبہ پیام تعلیم۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

وہ بھی کیا دن تھے

حکیم محمد سعید کے بچپن کی یادیں

مرتبہ

مسعود احمد برکاتی

مکتبہ پیام تعلیم۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

مجلس ادارت

سعدیہ راشد

مسعود احمد برکاتی ڈاکٹر سید فرحت حسین

تقسیم کار

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی .110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی۔ 110006

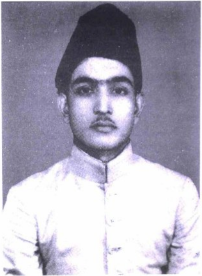
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ۔ 202002

دوسری بار: جنوری ۲۰۰۵ء تعداد: 1000 قیمت: /12 روپے

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی

فہرست



پہلی بات

زندگی تو سب ہی گزارتے ہیں لیکن بعض لوگوں کی زندگیاں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ بڑی سبق آموز ہوتی ہیں اور اس قابل ہوتی ہیں کہ ان کی نقل کی جائے۔ ایسی ہی ایک زندگی محترم حکیم محمد سعید صاحب کی بھی ہے۔ ان کے حالات پڑھنے کے قابل ہیں، سبق لینے کے لائق ہیں۔

حکیم صاحب ہمارے زمانے کی ان چند شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے صرف اپنے علم و عمل کی بنا پر عزت و احترام کا مقام حاصل کیا ہے۔ ان سے نہ صرف ملک میں اور ملک کے ہر طبقے اور ہر حلقے میں محبت کی جاتی ہے، بلکہ بیرون ملک بھی ان کے کاموں کو قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ حکیم صاحب ۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابھی چند سال ہی کے ہوئے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ محترمہ نے دینی تعلیم دلوائی، پھر اردو، فارسی اور انگریزی گھر ہی پر اساتذہ سے پڑھی اور طب کی تعلیم کے لیے کالج میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے قائم کردہ طبیہ کالج دہلی سے طب کی سند لینے کے بعد حکیم صاحب نے عملی زندگی میں قدم رکھا۔ بڑے بھائی حکیم عبدالحمید کی رہنمائی میں حکیم صاحب نے نہ صرف ہمدرد کے کاروبار میں عملی حصہ لیا بلکہ علمی لحاظ سے بھی ہمدرد کے کاموں کو ترقی دی۔ پبلسٹی کے شعبے میں حکیم صاحب نے زیادہ دلچسپی لی۔ اس کے علاوہ "ہمدرد صحت" کی ادارت بھی اپنے ذمے لے لی اور مطب بھی شروع کر دیا۔

پاکستان بن گیا تو حکیم صاحب نے سوچا کہ مسلمانوں کے اس سب سے بڑے ملک

میں طب مشرقی کی ترقی اور فروغ کے لیے کام کرنا چاہیے۔ چنانچہ حکیم صاحب پاکستان آ گئے۔ پاکستان نیا ملک تھا۔ یہاں ہر چیز کی کمی تھی۔ طب مشرقی کا علاج جڑی بوٹیوں اور نباتات پر مبنی ہے۔ اس وقت معمولی معمولی جڑی بوٹیوں کا ملنا بھی دشوار تھا لیکن ہمت اور حوصلہ ایسی چیز ہیں کہ ان کے سامنے کوئی مشکل ٹھہر نہیں سکتی۔ حکیم صاحب نے سخت مالی پریشانیوں کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور جو مقصد لے کر پاکستان آئے تھے وہ پورا کیا۔ ہمدرد کو ایک عظیم ادارہ بنا دیا۔

۱۹۵۳ء میں "ہمدرد نونہال" جاری کیا اور اس کے ذریعے نونہالوں کو ایسا ادب فراہم کیا جو ان کے لیے ذہنی تفریح کا ذریعہ بھی ہے اور ان کے علم میں اضافے کا وسیلہ بھی۔ حکیم صاحب نے مجھے اس کا ایڈیٹر مقرر کیا اور کہا کہ ہمدرد نونہال کو بچوں کا بہترین رسالہ بنانے میں اپنی پوری صلاحیتیں صرف کر دو۔ چنانچہ ہمدرد نونہال حکیم صاحب کی رہنمائی میں اس وقت نونہالوں کے لیے اردو کا سب سے بڑا سب سے مقبول اور مفید رسالہ ہے۔ ہمدرد نونہال کے پڑھنے والوں میں آج کے حکیم، ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر، اڈیٹر، افسر، تاجر سیاست داں اور سائنس داں اور دوسرے شعبوں کے ممتاز افراد شامل ہیں۔ ۴۵ سال میں ہمدرد نونہال نے ہمدرد کے دوستوں اور ہمدردوں کا ایک ایسا حلقہ پیدا کر دیا ہے جو آج ہمدرد کی عظیم تعلیمی تحریک میں حکیم صاحب کے ساتھ ہے۔

حکیم صاحب کو پاکستان بہت عزیز ہے اور وہ اس کے مستقبل کے لیے نونہالوں کو تیار کرنا چاہتے ہیں تا کہ وہ بڑے ہو کر پاکستان کو مضبوط اور خوش حال بنائیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک بہت اچھا اسکول قائم کیا۔ ہمدرد پبلک اسکول دس سال سے بڑی خوبی کے ساتھ نونہالوں کی تعلیم و تربیت کر رہا ہے۔

حکیم صاحب نے نوجوانوں کی اعلا تعلیم کے لیے ہمدرد یونیورسٹی بھی قائم کر دی ہے جس کے تحت دو طبیہ کالج بھی قائم ہیں۔ ایک کالج جدید طبی تعلیم دیتا ہے اور ایک قدیم طب کے حکما پیدا کرتا ہے۔ ہاں میں تو بھول گیا مشرقی طب کا کالج تو ۱۹۵۸ء سے قائم ہے اور ہزاروں اطبا پیدا کر چکا ہے۔ اس کالج کا افتتاح مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح نے کیا تھا۔

حکیم صاحب اپنی ساری مصروفیتوں کے باوجود سفر بھی بہت کرتے ہیں۔ وہ دنیا کے اکثر بڑے ملکوں اور شہروں میں جا چکے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ''سعید سیاح'' کہلانے لگے ہیں۔ انھوں نے صرف سفر ہی نہیں کیے بلکہ سفرنامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے دس سفرنامے تو بڑوں کے لیے شائع ہو چکے ہیں۔ نونہالوں اور نوجوانوں کے لیے حکیم صاحب کے سفرناموں کی تعداد ۳۶ ہے۔ یہ سفرنامے نونہال ادب کے تحت شائع ہو چکے ہیں۔ نونہال ادب کا شعبہ حکیم صاحب نے ۱۹۸۵ء میں بچوں کے لیے پاکیزہ اور صحت مند ادب شائع کرنے کے لیے قائم کیا ہے جو اب تک چار سو سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے۔ خود حکیم صاحب کی سو کتابیں چھپ چکی ہیں۔

حکیم صاحب کے کارنامے تو بہت ہیں، میں نے تو اب تک صرف چند گنائے ہیں اور محترم حکیم محمد سعید صاحب کی شخصیت کی صرف ایک جھلک ہی دکھائی ہے۔ اگلے صفحات میں نونہال جو کتاب پڑھنے والے ہیں اس میں حکیم صاحب نے اپنے بچپن کی باتیں مزے لے لے کر بیان کی ہیں۔ ان باتوں میں حکیم صاحب نے اپنی شرارتیں بھی بیان کی ہیں۔ اپنی تعلیم کا ذکر بھی کیا ہے، اپنے استادوں کے بارے میں اور اپنے خاندان اور بزرگوں کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ یہ کتاب اصل میں حکیم صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو میں نے ان سے ہمدرد نونہال کے خاص نمبروں کے لیے لکھوائے تھے۔ شاید پہلا مضمون ۱۹۸۳ء کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔ نونہالوں نے اس کو اتنی دلچسپی سے پڑھا کہ پھر تو میں نے ہر سال حکیم صاحب سے اصرار کر کے ایک مضمون لکھوایا۔ اب مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ایک کتاب بنا دی جائے۔ چنانچہ ایسے تمام مضامین تلاش کر کر کے جمع اور مرتب کیے۔ اس طرح یہ ایک ایسی کتاب بن گئی جو نہ صرف مزے دار ہے بلکہ اس سے ''حکیم محمد سعید'' کی پہلو دار، متحرک، پُرکشش اور کامیاب شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

''وہ بھی کیا دن تھے'' ایک ایسی کتاب ہے جو نونہالوں اور نوجوانوں کے لیے ہی نہیں، بڑوں کے لیے بھی ولولہ انگیز اور حوصلہ افزا ثابت ہوگی۔

مسعود احمد برکاتی

میری ابتدائی تعلیم

نونہالو! تم میری تعلیم کی بات نہ پوچھو! میں کسی اسکول میں گیا ہی نہیں! اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا بتاؤں۔

یہ تم نے خوب سمجھ لیا ہے کہ میں نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں کہ جو سراسر مذہبی تھا اور دینی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلی کے ایک نہایت بزرگ اللہ کے بندے تھے۔ ولی اللہ تھے۔ دہلی کے ایک بڑے بزرگ حضرت اخوند جیؒ ان کے سلسلے کے تھے۔ میرے والدان کے مرید تھے۔ ہمارے خاندان کا تعلق دین کے بزرگوں سے رہا ہے۔ اس لیے میری تعلیم بھی اسی انداز سے ہوئی۔

محترمہ والدہ صاحبہ کا فیصلہ تھا کہ سب سے پہلے تعلیم قرآن حکیم کی ہوگی۔ اول ناظرہ اور پھر حفظ، اس کے بعد دوسری تعلیم! اس فیصلے کے آگے کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔

میری سب سے پہلی استانی چچی جان بنیں۔ سب لوگ ان کو چچی جان کہا کرتے تھے۔ مجھے تو آج بھی ان کا نام معلوم نہیں ہے۔ ہاں ان کے دین دار شوہر کا نام داروغہ رحیم بخش تھا۔ حوض قاضی دہلی کے تھانے میں نگراں تھے۔ ان کا بڑا دبدبہ تھا۔ ہم ان کو چچا جان کہا کرتے تھے۔ میں ان کو استاد بھی کہتا ہوں۔ میں ابھی تین ہی سال کا تھا کہ مدرسۂ قرآن میں بٹھا دیا گیا۔ مدرسہ کیا تھا، یہ چچی جان کا گھر تھا اور وہ شوقیہ بلکہ ثواب کے لیے بچوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتی تھیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ محترم چچا جان بڑے دیانت دار بزرگ تھے۔ ان کے ہاں ایک ہی وقت کھانا پکتا تھا۔ دونوں وقت وہی کھاتے پیتے تھے۔ گزر اوقات بہ مشکل ہوتی تھی۔ اس لیے محترمہ چچی جان کپڑا فروخت کرتی تھیں۔ ان کے ایک بھائی تھے۔ نام عبدالجبار تھا۔ بڑے غصیلے انسان تھے۔ ان کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اس زمانے میں کپڑوں کے ٹکڑوں (کٹ پیس) کا دور تھا۔ کٹ پیس کے تکیے بنا دیے جاتے تھے۔ چچی جان یہ تکیے منگوایا کرتی تھیں۔ اب اگر قسمت اچھی ہے تو اچھے ٹکڑے

نکل آئے، ان کو بیچ کر گھر کا خرچ چلاتی تھیں۔

نونہالو! تم نے دیکھا، تھانہ حوض قاضی کا انچارج اور اس کے گھر میں ایک وقت چولھا جلتا تھا۔ اس دور میں پولیس اس قدر دیانت دار ہوتی تھی! میری ابتدائی تربیت میں چچا جان کا بہت حصہ ہے۔ بڑے شفیق اور بڑے نفیس انسان تھے۔ سارا علاقہ ان سے محبت کرتا تھا۔

نونہالو! چچا جان اتوار کی اتوار ہم تین چار بچوں کو دہلی کی سیر کرانے کے لیے لے جایا کرتے تھے۔ میں لازماً ہر گروپ میں ہوتا تھا۔ گویا دہلی کی سیر ہماری تعلیم کا ایک حصہ تھی۔ ایک اتوار کہیں اور، دوسرے اتوار کہیں اور۔ روز قرآن کی تعلیم اور دہلی کے تاریخی مقامات کی اتوار کے اتوار سیر، خوب دل لگتا تھا۔ لو بھئی، میں نے ابھی عمر کے پانچ سال بھی پورے نہیں کیے تھے کہ قرآن حکیم ناظرہ ختم کر لیا۔

نونہالو! جب ختم قرآن ہوا تو سب سے زیادہ خوش میری والدہ محترمہ تھیں۔ ان کو بڑی مشکل سے یقین آیا کہ میں نے قرآن حکیم ختم کر لیا۔ مجھے یاد ہے کہ چچی جان سے باتیں کر رہی تھیں: ''بوا! سچ بتاؤ، سعید نے پورا قرآن ختم کر لیا ہے؟'' چچی جان نے بڑے فخر سے جواب دیا تھا: ''لو بی اور لو، تم کو یقین کیوں نہیں آتا؟''

نونہالو! اس محلے کی ایک بات مجھے یاد آتی ہے۔ یہاں ایک اکھاڑا تھا۔ میں صبح آتے جاتے اور شام ماموں فضل کے کندھوں پر سوار جاتے یہاں جھانکا کرتا تھا۔ یہاں پہلوان ورزش کرتے تھے۔ ہمارے چچا جان کو یہ جگہ پسند نہیں تھی۔ اس لیے وہ منع کرتے تھے کہ ادھر نہ جانا مگر مجھے وہاں تاکا جھانکی میں بڑا مزہ آتا تھا۔

ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ اکھاڑے کی چکنی مٹی میں ایک پہلوان تیل ڈال رہا ہے۔ بڑی حیرت ہوئی۔ دوسرے دن دیکھا کہ پھاوڑے سے اکھاڑہ کھودا جا رہا ہے اور نرم کیا جا رہا ہے۔ کھدائی تو روزانہ کرنی ہوتی تھی۔

یہ پہلوانی میں فراموش نہ کر سکا۔ بڑے ہو کر میں نے بھی استاد ماہ رخ خاں کے اکھاڑے میں جانا شروع کر دیا تھا۔ لڑنٹ کرتا تھا اور ایک بار تو دنگل میں بھی کشتی لڑا تھا۔

نونہالو! یہ بڑی دلچسپ داستان ہے۔ اس زمانے میں گاما پہلوان اور ان کے بھائی

امام بخش پہلوان کا توتی بول رہا تھا۔ امام بخش رستم ہند اور گاما جی رستم زماں تھے۔ ان دونوں سے ملنے کو بڑا دل چاہتا تھا۔ ان کے ایک عزیز رحیم سلطانی پہلوان تھے، ان دنوں ریٹائر ہو گئے تھے۔ ان کی بڑی عزت تھی۔ ان سے ملا۔ ان کا فوٹو اب بھی میرے پاس ہے۔

گاما پہلوان سے ملاقات پاکستان میں ہوئی۔ وہ لاہور میں میرے مطب میں تشریف لائے تھے۔ ان کی عزت کے لیے کھڑا ہو گیا۔ بے قرار ہو کر میں نے ان کو سینے سے لگا لیا۔ وہ بڑے خوش ہوئے۔ میں نے رستم زماں گاما پہلوان کے حالات پر ایک کتاب بھی تیار کرائی۔ ادیب الملک نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی نے یہ کتاب لکھی تھی اور ہمدرد اکیڈمی نے شائع کی تھی۔ میں گاما جی سے ان کے آخری وقت تک ملتا رہا، ان کے گھر جاتا تھا۔ وہ بیمار ہوئے تو میں ان کے سرہانے تھا۔

نونہالو! میری والدہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ وہ قرآن حکیم کی تلاوت بھی نہیں کر سکتی تھیں مگر وہ قرآن حکیم کی سطروں پر انگلی رکھ کر اور چلا کر روزانہ ایک پارہ پڑھتی تھیں، مگر انھوں نے اپنی سب اولاد کو پڑھایا لکھایا۔ میرے والد تو ابھی ۴۲ سال ہی کے تھے کہ ۱۹۲۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے مرنے کے بعد ہمدرد کا سارا کاروبار میری والدہ نے پردے میں رہ کر سنبھالا تھا۔ یہ کہانی میں تم کو سنا چکا ہوں۔ ایک تو تعلیم یافتہ نہ تھیں۔ پھر سخت پردہ کرتی تھیں مگر پھر بھی حکومت کرتی تھیں۔

نونہالو! اب تو مزہ آ گیا۔ بڑی شاندار تقریب ہوئی۔ آمین کی تقریب! اس زمانے (۱۹۲۶ء) میں ختم قرآن کی تقریب بڑی شاندار ہوتی تھی۔ اسے آمین کی تقریب بھی کہتے ہیں۔ مجھے اپنی آمین کی تقریب خوب خوب یاد ہے۔ میں دولھا بنایا گیا تھا۔ کم خواب کی سفید شیروانی بنی تھی۔ بڑی بھڑک دار تھی۔ اس کی بھڑک مجھے آج بھی یاد ہے۔ سہرا بندھا تھا۔ بدھی پہنائی گئی تھی۔ بہت سارے بچے بھی آئے تھے۔

نونہالو! اس زمانے میں تین بڑی تقریبیں ہوتی تھیں۔ بسم اللہ کی تقریب یعنی تعلیم قرآن شروع کرنا۔ آمین کی تقریب یعنی ختم قرآن اور ایک بڑی تقریب بچے کا پہلا روزہ رکھوانا۔ شادی بیاہ کی تقریبوں سے زیادہ خرچ ان پر کیا جاتا تھا۔

میری تقریب آمین میں بہت سارے بچے آئے تھے۔ اس موقع پر ایک کتاب پڑھی گئی تھی مجھے یاد نہیں کہ اس کتاب کا نام کیا تھا۔ اس میں اشعار تھے۔ ایک بچہ ایک ایک شعر پڑھ رہا تھا اور سارے بچے زور سے آمین کہہ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بیس پچیس شعر تھے۔ اتنی ہی بار گھر آمین سے گونج گونج اٹھتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے۔ آمین کہنے والے سب بچوں کو میری والدہ نے تام چینی کی پلیٹوں میں کھوئے کی مٹھائی دی تھی۔ سبز رومال میں ہر پلیٹ بندھی ہوئی تھی اور ہاں ہر بچے کو ہار پہنایا گیا تھا۔

نونہالو! اسی آمین کی تقریب میں اعلان ہوا کہ محمد سعید اب قرآن شریف حفظ کرے گا۔ یہ اعلان میری والدہ کی طرف سے تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب میں نے یہ اعلان سنا تو میرا تو دم نکل گیا تھا! سوچا، تو اب سارا قرآن حفظ کرنا پڑے گا! بڑی مشکل آئی۔ مگر میں دم نہیں مار سکتا تھا۔ کوئی بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو میری والدہ کا فیصلہ تھا۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے میرے بڑے بھائی جان مجھے اسکول میں داخل کرانا چاہتے تھے مگر ایسا نہیں ہو سکا۔

چچی جان حوض قاضی دہلی میں حویلی رضیہ بیگم میں رہتی تھیں۔ وہیں ایک اونچی مسجد تھی۔ اب بھی ہے۔ اسے گاڑی بانوں کی مسجد کہا جاتا ہے۔ اس مسجد میں ایک مدرسہ تعلیم القرآن تھا۔ اسے ایک انجمن تعلیم القرآن چلاتی تھی جس کا صدر دفتر فراش خانہ دہلی میں تھا۔ چچا جان نے فیصلہ کیا کہ محمد سعید کو یہاں قرآن شریف حفظ کرنے کے لیے داخل کر دیا جائے۔ چنانچہ چچا جان ہی مجھے وہاں لے گئے۔ مدرس تھے جناب حافظ سید عمر دراز علی۔ مجھے ان کی شاگردی میں دے دیا گیا۔

حافظ سید عمر دراز علی صاحب زیادہ بوڑھے نہ تھے۔ صدر بازار دہلی میں ان کا گھر تھا۔ ان دنوں ٹرام چلتی تھی۔ شاید ایک پیسہ جانے آنے کا کرایہ تھا۔ حافظ صاحب وقت کے سخت پابند تھے اور ویسے بھی سخت مزاج تھے۔ ان کو مرگی کی بیماری تھی۔ مہینے میں ایک بار ان کو مدرسے میں دورہ پڑ جاتا تھا۔ ان کو جب دورہ پڑتا تو سب لڑکے بڑے خوش ہوتے کہ اب چھٹی مل جائے گی مگر مجھے دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا تھا۔ سوچتا تھا کہ یہ کیا مرض ہے۔ لوگوں نے کہا تھا کہ مرگی ہے۔ مدرسہ تعلیم القرآن کا مہینے میں ایک بار معائنہ ہوتا تھا۔ انسپکٹر آتے تھے۔ بچوں کا امتحان لیتے تھے۔ میرا بھی امتحان ہوتا تھا۔ شاید اس مدرسے میں سب سے زیادہ قرآن مجھے ہی یاد ہوتا تھا۔ میرا کوئی مقابلہ نہ تھا۔

بچپن کی شرارتیں

شرارت ایک ایسی دلچسپ مزاجی کیفیت اور انسانی حرکت ہے کہ اس سے کوئی انسان خالی نہیں ہے۔ بچہ ہو یا بڑا، عورت ہو کہ مرد، کہنا چاہیے کہ شرارت اس کی گھٹی میں پڑی ہے یا یہ کہ اس کی فطرت میں داخل ہے اور اس کے مزاج کا حسن ہے۔ شرارت اور شرافت جب تک ساتھ رہتے ہیں اس سے انسانیت اور لطافت کی پھل جھڑیاں چھٹتی ہیں۔ انسان کے دل کا حسن آشکار ہوتا ہے۔ شرارت تو وہ ہے کہ جس سے دل باغ باغ ہو، نہ یہ کہ شرارت سے دل کے پھپھولے پھوٹیں اور دل آزاری ہو۔

خیر، اب ایک شرارت تو یہ ہے کہ مسعود احمد برکاتی چپکے سے آتے ہیں اور میرے سامنے ادب اور خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ ادیب ہیں اور ادب ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ خاموش بیٹھ کر جب وہ ایک عینک اتاریں اور دوسری چڑھائیں اور بار بار یہ حرکت کریں تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ ضرور دال میں کالا ہے۔ وہ کوئی مسئلہ لائے ہیں۔ ایک بار جب وہ اس انداز سے آئے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ بلی تھیلے سے جلدی ہی باہر آگئی۔ فرمانے لگے:

"ہمدرد نونہال کی اشاعت خاص اب بڑی تیزی سے تیاری کی منزلوں میں ہے۔ اس کا ایک کالم "شرارت" ہے۔ بڑوں کی بچپن میں شرارتیں! آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنی چند شرارتیں سپرد قلم فرما دیجیے۔"

"یہ کیا شرارت ہے؟" میں نے برکاتی صاحب سے کہا اور گھبرا کے انکار کر دیا، مگر وہ تھے کہ آمادۂ شرارت۔ ہر دن یاد دہانی اور ہر شام تقاضوں پر انھوں نے کمر باندھ لی۔ ہمدرد نونہال سے جس طرح مجھے عشق ہے، برکاتی صاحب بھی اس کے بڑے عاشق ہیں۔ میں اور برکاتی صاحب کیا، ہمدرد نونہال کا تو ہر نونہال عاشق ہے۔ چھوٹے نونہال بھی اور بڑے

نونہال بھی! برکاتی صاحب اور میرا عشق ذرا سوا ہے کہ ہم دونوں مل کر پیارے نونہالانِ وطن کے لیے ہمدرد نونہال ہر مہینے تیار کرتے ہیں اور اس طرح مرتب کرتے ہیں کہ اس سے نونہالانِ وطن کی تعلیم و تربیت کا سامان ہو اور صحت و تفریح کا انتظام۔

میں گھبرایا یوں کہ اگر میں نے اپنی شرارتیں لکھ دیں تو میرا راز فاش ہو جائے گا۔ میں جو آج بڑا بھولا بنا پھرتا ہوں، شرارتیں اپنے قلم سے لکھ دیں تو میرا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ دھڑام سے گر پڑوں گا۔ جاگو جگاؤ کے لیے قلم پھر کیسے اٹھاؤں گا! بھئی میں نے تو صاف انکار کر دیا۔ اب تو برکاتی صاحب گھبرائے اور بہت ٹپٹائے۔ چہرے پر ایک رنگ آئے اور ایک جائے۔ ہوائیاں اڑ گئیں! مگر میرے انکار کے ساتھ ان کا اصرار بڑھتا گیا۔ دن پر دن گزرتے رہے۔ ہمدرد نونہال مرتب ہونے لگا۔ میرا خانہ خالی تھا اور میرا صفحہ صاف تھا۔ کون اسے کالا کرے۔

برکاتی صاحب بڑے غضب کے انسان ہیں۔ بے پناہ ضدی! ان کی شرارتوں میں کمی نہ آئی۔ آخر انھوں نے مجھے شرارتیں لکھنے پر آمادہ کر ہی لیا۔ وہ جیتے، میں ہارا۔ خیر ہار تو میں گیا، مگر سوچتا رہا کہ اب کیا لکھوں۔ عمر گزر گئی، برسوں بیت گئے۔ بچپن کو آواز دوں تو کیسے؟ ماضی میں جھانکتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں کہ پُر از شرارت ہے! شرارتوں پر غور کرتا ہوں تو ان کو ایک سے ایک خطرناک پاتا ہوں، ایسی خطرناک کہ اگر آج بچوں کو بتا دوں تو وہ بھی ڈر جائیں، کانپ اٹھیں۔ آخر کو میں حکیم سعید ہوں۔ چھوٹی موٹی شرارتیں کیسے کر سکتا ہوں! خیر اب میں چھانٹ چھونٹ کر دو تین اپنی شرارتیں لکھے دیتا ہوں مگر پہلے وعدہ ہو جائے کہ کوئی نونہال ان کو دہرائے گا نہیں۔

ملّو بڑی پیاری تھی۔ ہم سب اس سے بہت محبت کرتے تھے اور ہم کیا، وہ پورے محلے کی چہیتی تھی۔ کیا مجال کہ ملّو سے کسی کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ بچے بھی اس کو پیار کرتے اور بڑے بھی تھپتھپاتے۔ حاجی بابو فضل الٰہی صاحب، میرے سب سے بڑے ماموں، ملّو ان کی پروردہ۔ حاجی بابو کی ذات سے بھی کسی کو کبھی نقصان نہیں پہنچا، ملّو تو ان کا چرباتھی۔ ایسی گائے میں نے تو پھر دیکھی نہیں۔

شب برأت کا دن تھا۔ پٹاخوں، پھلجھڑیوں کا زور۔ پٹاس کی گولیاں بھڑ ادھڑ بج بجا رہے تھے۔ رنگ برنگ کے انار چھوٹ رہے تھے۔ پٹاخوں کی لڑیاں چٹاچٹ، پٹاپٹ دھڑک رہی تھیں۔ محلے بھر کے بچے اور میں ان کا سردار۔ ایک شور تھا کہ برپا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ملّو ماحول سے بے پروا مٹک مٹک چلی آ رہی ہے۔ یہ شام کا وقت تھا۔ ملّو دن بھر گلی گلی بازار بازار سیر کرتی۔ ہندوؤں کا محلہ اور بازار، کوئی اسے کچھ نہ کہتا۔ دودھ دوہنے کا وقت ہوتا اور وہ گھر واپس آ جاتی۔ آپا فاطمہ دودھ دوہتیں اور ملّو اس فرض سے فراغت پا کر منڈگشت کے لیے پھر باہر۔

اب جو وہ باہر آئی تو میرے ہاتھ میں پٹاخوں کی ایک لڑی تھی۔ تاگا لیا اور لڑی کو ملّو کی دم سے باندھ دیا اور دیا سلائی دکھا دی۔ بارود نے آگ سیکنڈوں میں پکڑ لی اور پوری شدت سے پٹاخے چھوٹنے لگے۔ ملّو کو اس ناگہانی آفت کا احساس ہوا تو وہ بے چین ہو گئی۔ پھر ڈر گئی اور ڈر کر جو بھاگی تو کئی بچے اس کی لپیٹ میں آئے مگر بچ بچ گئے۔ آخر جھنو درزی کی ماں ملّو کی ٹانگوں میں روندی گئی۔ پٹاخوں کی لڑی ختم ہو چکی تھی اور جھنو کی ماں زخمی۔ ملّو نے بازار سیتارام کا رخ کیا۔ ہم بچے اس تماشے پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ گئے، مگر جب زخمی ماں کی چیخیں سنیں تو ہوش ٹھکانے آ گئے۔ بڑی پوچھ گچھ ہوئی۔ حاجی بابو کے لیے بھی یہ حادثہ غیر متوقع تھا اور بڑا ہی تکلیف دہ۔ محلے کا محلہ جمع ہو گیا۔ اب کوئی قبول کر کے نہ دے کہ گائے کی دم سے لڑی باندھی کس نے تھی۔

غرض بڑی لے دے ہوئی۔ جھنو درزی بھی آ گیا۔ میری طرف تو کسی کا خیال تک نہ گیا، مگر کئی دوسرے بچے پٹ گئے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے جرأت سے کام لیا اور اپنا گناہ فوراً تسلیم کر لیا۔ میں جھنو کی ماں کے پاس گیا۔ وہ مجھے بڑا پیار کرتی تھیں۔ میں ان کی سوئیوں میں تاگا ڈال دیا کرتا تھا۔ انھیں مجھ پر پیار آ گیا۔ معاملہ رفع دفع ہوا۔ آپا (میری والدہ محترمہ) نے خوب خبر لی۔ سزا کے طور پر ساری آتش بازی ضبط ہوئی اور ایک ہفتے کے لیے گھر سے باہر قدم رکھنے کی مناہی۔

پاکستان بن گیا۔ کوچۂ کاشغری چھٹا۔ بازار سیتارام چھٹا۔ میں پاکستان آ گیا مگر اس

کے بعد دلی جب بھی گیا، جھنو اور اس کی ماں کے پاس جاتا رہا۔ اب اس سال عید گزرگیا تو ماں تو اللہ کو پیاری ہو ہی چکی تھیں، اب کے پتا چلا کہ جھنو بھی چل بسا۔

اب اپنی شرارت کی معافی مانگوں تو کس سے۔

ایک بار افغانستان سے فٹ بال کی ایک ایسی ٹیم آئی کہ اس نے دلی والوں کے چھکے چھڑا دیے۔ میں دہلی ینگز کا کھلاڑی تھا۔ مقامی فٹ بال ٹورنامنٹ میں دہلی ینگز کسی سے نہیں ہارتی تھی۔ افغان ٹیم کا کھیل تو فرسٹ کلاس نہ تھا مگر ان کی طاقت اور زور کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ٹورنامنٹ شروع ہوئے۔ افغان ٹیم کے مقابلے پر جو آیا پسپا ہو گیا۔ پسپائی بھی ایسی ویسی نہیں، دس دس گول، بارہ بارہ گول سے۔ دہلی مغلز کا انجام بھی یہی ہوا اور جمعہ کے دن مقابلہ دہلی ینگز سے ٹھہرا۔ فائنل میچ۔ افغانی زور و شور اور شہرت یہ کہ کیا مجال کوئی ہندی کھلاڑی کسی افغانی کے سامنے ٹھہر سکے۔

شرارت سوجھی اور خوب سوجھی۔ میٹنگ ہوئی۔ کل کا انجام سامنے تھا۔ کیا کیا جائے۔ میں نے تجویز رکھی کہ ''ان افغانوں کی کل ناشتے کی دعوت کی جائے۔''

دعوت قبول ہوئی۔ ہم نے خمیری روٹیوں کا اہتمام کیا اور شان دار نہاری کا انتظام۔ نہاری حاجی کے ہاں سے لی گئی۔ حاجی کا دعوا یہ تھا کہ اس کی نہاری ''شاہی نہاری'' ہے۔

اس شاہی نہاری کا عقدہ اس وقت کھلا کہ جب حاجی کا بڑا لڑکا میرا ہم جماعت بنا۔ یہ حاجی کا بڑا لڑکا آج لاہور میں سب سے لذیذ نہاری والا ہے۔ میں ملتا ہوں تو پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

بتایا گیا کہ نہاری کی دیگ بہادر شاہ کے دور کی ہے اور اس دور میں حاجی کے بڑوں کی دکان میں جس جگہ لا کر جمائی گئی تھی وہاں سے ہٹائی نہیں گئی ہے۔ آج تک یہ نہ دھلی اور نہ اس پر قلعی ہوئی۔ ایک نہاری کا گھان ختم ہوا تو دوسرا پڑ گیا۔ سلسلہ ہے کہ چل رہا ہے۔ ''شاہی نہاری'' کی تعریف یہ ہوئی۔

ہاں تو جمعہ کی صبح ہوئی۔ نلیوں کے گودے سے اٹی ہوئی اور بھیجے سے بھری ہوئی شاہی نہاری لائی گئی۔ اہتمام یہ ہوا کہ خمیری روٹی گرم گرم تندور میں سے نکلے اور دست افغان میں

آ جائے۔ واہ وا! افغانوں نے دبا کر ہاتھ دیے اور مرچوں کی وجہ سے ہر نوالے کے ساتھ ٹھنڈا پانی بھی پیتے رہے۔ فارغ ہوئے تو شکم میں ابھار! ہر پیٹ تنا ہوا۔ ایک تو نہاری روٹی، اوپر سے پانی۔ روٹی اندر جا کر پھولی اور خوب پھولی۔ آرام کے لیے پورا پورا انتظام تھا۔ شاہی نہاری کھا کر افغانوں نے چادریں تان لیں اور ایسے سوئے کہ نماز تک کا ہوش نہ رہا۔ بارے آنکھ کھلی تو بھاگم بھاگ دوگانہ جمعہ ادا کر کے کھیل کے میدان کا رخ کیا۔

دہلی ینگز کا ہر کھلاڑی خالی پیٹ اور افغام ٹیم کا ہر کھلاڑی پیٹ بھرا۔ عقیل اور مجن دونوں کا حال یہ کہ ہنستے ہنستے پاگل ہو ہو جائیں۔ حافظ رشید بڑے متین کھلاڑی تھے مگر وہ بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ دوسرے کھلاڑیوں کا حال بھی ایسا ہی تھا۔

وسل ہوئی۔ ریفری یاد نہیں کون تھا۔ دونوں ٹیمیں میدان میں اتریں، کھیل شروع ہوا۔ انجام معلوم! افغانوں کی ایک پیش نہ گئی اور ان کا زور ٹوٹ گیا۔ دہلی ینگز نے ان کو پیٹ کر رکھ دیا۔

اوکھلا دہلی کا ایک واقعہ ہے۔ اس وقت تک جامعہ ملیہ اسلامیہ وہاں نہیں آئی تھی۔ میں کشتی رانی کے لیے گیا۔ وہاں کشتی بان سے اختلاف رائے ہو گیا۔ تو تو میں میں تک نوبت پہنچ گئی۔ میں نے اس کے ایک مکا رسید کیا۔ شاید یہ محمد علی کلے کے انداز کا مکا تھا۔ بچارے کے کئی دانت جھڑ گئے۔ اوکھلے میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ گھنٹے بجنے لگے اور دروازے بند ہونے لگے۔ پھر بھی میں وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا مگر اوکھلا انتظامیہ نے تھانے میں رپٹ درج کرا دی اور سمن جاری ہو گئے۔ پیشیاں ہوئیں۔ بھائی جان جیسے مصروف انسان کہ جسے ایک لمحے کی فرصت نہیں، میرے ساتھ پیشی میں جاتے اور حالات کا مقابلہ کرتے۔ آخر عدالت نے بیچ بچاؤ کرا دیا اور فیصلہ ہو گیا۔ تمام پیشیوں میں بھائی جان بہ نفس نفیس گئے مگر انھوں نے ایک لفظ بھی سرزنش کے طور پر مجھ سے نہیں کہا، ضبط کیا اور برداشت۔

واللہ، ایسی شرم طاری ہوئی کہ ساری عمر کے لیے فیصلہ کر لیا کہ اب کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔

کچھ اور شرارتیں

میرے بہت بچپن میں ایک کھیل ہوتا تھا۔ نام تھا اس کا "کیل کیل کانٹیاں۔" یہ کوئی ۱۹۲۷ء کی بات ہے۔ میں اس وقت سات سال کا تھا۔ میں نے پہلا حج ۱۹۲۷ء ہی میں کیا تھا۔ قرآن حکیم حفظ کرتا ہوا حج کو گیا تھا، پھر واپس ۶ ماہ بعد آ کر نو سال کی عمر میں پورا قرآن حفظ کر لیا تھا، الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ حافظ سید عمر دراز علی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں۔ بہت خوب انسان تھے۔ میرے استاد تھے۔

ہمارا محلہ کوچہ کاشغری کہلاتا تھا۔ بہت اچھا نام تھا۔ اس میں پرانے زمانے کی ایک بہت ہی بڑی حویلی تھی۔ کوچہ بھی بہت بڑا تھا۔ یہاں ہمارا پورا خاندان آباد تھا۔ باقی سب ہندو تھے۔ بڑے اطمینان سے رہا کرتے تھے۔ "کیل کیل کانٹیاں" کے لیے یہ محلہ خاصی شہرت رکھتا تھا۔ کھیل یہ تھا کہ دو ٹیمیں بن جاتی تھیں۔ شاید ہر ٹیم میں تین بچے ہوتے تھے۔ کوچہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ ہر ٹیم کیل کانٹیوں میں مصروف ہو جاتی تھی اور اپنے حصے میں پوشیدہ تر مقامات اور در و دیوار پر باریک پنسل سے نشانات لگاتی تھی۔ جتنے چاہے نشانات لگا دو، کوئی پابندی نہ تھی۔ ہاں وقت آدھے گھنٹے کا مقرر تھا۔ پھر اعلان ہو جاتا کہ نشانات لگا دیے گئے ہیں۔ اب پہلی ٹیم دوسری ٹیم کے علاقے میں جاتی اور نشانات تلاش کرتی اور ان کو کاٹتی جاتی۔ حتیٰ کہ اعلان کر دیتی کہ تلاش اور کاٹ کا سلسلہ ختم ہوا۔ اعلان کے بعد دوسری ٹیم ان نشانات کو ڈھونڈتی تھی جو تلاش سے رہ گئے۔ ان نشانات کو گنا جاتا تھا اور نوٹ کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد دوسری ٹیم پہلی ٹیم کے علاقے میں جا کر نشانات تلاش کرتی اور کاٹتی اور اعلان کے بعد کٹنے سے جو نشانات بچ رہتے ان کو گنا جاتا تھا۔ اس گنتی پر فتح کا دار و مدار تھا۔ جس ٹیم کے نشانات کی تعداد زیادہ ہوتی یعنی تلاش میں ناکامی کے بعد بچے

ہوئے نشانات کی تعداد جس ٹیم کی زیادہ ہوتی وہی جیتا کرتی اور جس کے نشانات کم ہوتے وہ ہارتی تھی۔

اب جناب کوچہ تو محدود تھا اور کھیل روز کا معمول۔ در و دیوار اور دوسرے مقامات کیلوں اور کانٹیوں سے سیاہ ہو چکے تھے اور کھیل مشکل ہوا جا رہا تھا۔ مجھے اس کھیل سے دلچسپی تھی۔ تلاش اور جستجو کا جذبہ مجھے اس کھیل سے ملا ہے۔ اس کھیل کو میں نے شرارت کے طور پر ایک نیا رخ دیا۔ ایک دن ذہن میں بجلی سی کوندی اور میں ماموں عبدالعزیز صاحب کی دکان پر پہنچ گیا۔ کاغذ بہت سا میرے پاس تھا۔ دکان گلی مرغاں میں تھی۔ بازار سیتارام تھا۔ منہ بولے ماموں عبدالعزیز کپڑوں کی چھپائی کا کام کرتے تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد بھی تھے۔ ان کے پاس بندکیوں کے چھاپے تھے۔ میں نے ان چھاپوں سے کاغذ پر بندکیاں (کیلیں) چھاپیں اور اپنے ساتھ لے آیا۔ دوسرے دن کیل کانٹیاں کھیل میں میں نے یہ کاغذات اپنے علاقے میں ایک لیٹر بکس نمبر ۷۰ میں ڈال دیے۔ یہ لیٹر بکس نمبر میرے حقیقی ماموں نور محمد اور ماموں عنایت الٰہی صاحب کے ہمدم دواخانے کا تھا۔ جب نشانات کی تلاش ہوئی اور کٹائی کا سلسلہ شروع ہوا تو کسی نے اس لیٹر بکس کو نہ دیکھا جس میں ہزارہا بندکیوں (نشانوں) والے کاغذ تھے۔ یہ تلاش میں نہ آئے اور اعلان کے بعد جب گنتی شروع ہوئی تو میں نے لیٹر بکس سے یہ کاغذ نکال کر سامنے رکھ دیے اور مطالبہ کیا کہ ان کو گنا جائے۔

دوسری ٹیم نے احتجاج کیا کہ یہ نشانات نہیں ہو سکتے۔ میں نے بحث کی اور دلیل دی کہ یہ بندکیاں بہرحال نشانات ہیں اور میں بحث میں جیت گیا اور کھیل میں جیت گیا۔ اس کے بعد ایک حربہ میں نے یہ استعمال کیا کہ میں نے ایک ایسا کرتا پہن لیا جس پر بندکیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اعلان کے بعد جب گنتی ختم ہوئی تو میں نے خود کو پیش کر دیا کہ میرے کرتے کی بندکیاں گنی جائیں۔

ایک شور مچ گیا! مگر میں نے ان ہی دلائل پر مقدمہ اور کھیل جیت لیا جن پر میں نے لیٹر بکس والے کاغذات کا مقدمہ جیتا تھا۔ اس طرح کیل کیل کانٹیاں ایک سائنٹفک کھیل

بن گیا، مگر بچوں نے اسے شرارت قرار دیا۔ اب نونہال فیصلہ کریں کہ یہ شرارت تھی یا ذہانت۔

میں جب طبیہ کالج دہلی میں داخلے کے لیے لے جایا گیا تو جناب رجسٹرار (حکیم مولوی عبدالحفیظ صاحب) نے صاف انکار کر دیا کہ کالج میں داخلے کی یہ عمر نہیں، مگر جب اصرار بڑھا اور درخواست موثر ہوئی تو ٹیسٹ ہوا۔ عربی بھی کافی اچھی تھی اور فارسی بھی خوب تھی اور اردو تو خیر اچھی تھی ہی۔ داخلہ ہو گیا۔ طبیہ کالج میں دو دوست بنے، محمد احسن عباسی (جو بعد میں کراچی میونسپل کارپوریشن کے میئر ہوئے اور پاکستان کے سفیر) دوسرے دوست جناب پیر غلام محی الدین مجددی۔ یہ دوست سے زیادہ بزرگ محسوس ہوا کرتے (ان کے ہزارہا مرید ہیں سندھ میں) پیر صاحب کے پاس ایک ناخن تراش تھا۔ بڑا انوکھا۔ کسی مرید نے نذر کیا تھا۔ میرا اصرار تھا کہ جناب غلام محی الدین صاحب یہ ناخن تراش میری نذر کر دیں مگر پیر صاحب بھلا کب ماننے والے تھے۔ جب میں اصرار کرتا، بچہ سمجھ کر ٹال دیتے۔ ٹالتے رہے۔ میں ان کو نوٹس دیتا رہا کہ دیکھیے اگر مجھے آپ نے نہ دیا تو میں اسے چرالوں گا مگر مولانا تالے قفل سے چوکنا رہتے تھے۔ آخر ایک دن میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ محمد احسن عباسی صاحب کو ہم راز بنایا اور ایک دن جب کہ پیر صاحب کلاس میں تھے، ہم ان کے کمرے میں گئے، الماری کی کنڈی کے اسکرو کھولے، الماری کھولی، ناخن تراش چرالیا۔ الماری کا چھپکا دوبارہ فٹ کر دیا۔

چوری کا بڑا چرچا ہوا۔ نہ میں نے بتا کر دیا اور نہ بھائی احسن نے راز افشا کیا حتی کہ طبیہ کالج کی تعلیم ختم ہو گئی۔ بھائی احسن اور پیر غلام محی الدین کراچی اور ٹنڈو جام سدھارے۔ پاکستان بنا۔ میں بھی پاکستان آیا۔ ان دوستوں سے ملاقاتیں بھی رہیں مگر ناخن تراش کا راز راز ہی رہا۔

حادثہ پیش آیا کہ ۱۹۴۷ء میں دہلی میں نمبر ۱۰ دریا گنج لوٹ لی گئی۔ مکان کے ساتھ میرا سامان بھی سب کا سب شرنارتھی (علاقہ پاکستان سے ہندستان آنے والے لوگ) اٹھا کر لے گئے اور اس میں وہ چوری کیا ہوا ناخن تراش لُٹ گیا۔

۱۹۵۶ء میں، میں جب یورپ کا دورہ کر رہا تھا تو روم (اٹلی) میں ایک دکان پر دیکھا کہ بالکل ویسا ہی، من وعن وہی ناخن تراش رکھا ہے۔ میں نے فوراً خرید لیا اور پاکستان لے آیا۔ یہ میں نے ایک خط کے ساتھ عالی مرتبت جناب غلام محی الدین مجددی سرہندی کی خدمت اقدس میں بھجوا دیا۔ اس خط میں میں نے اپنی شرارت اور اپنی ۱۹۳۶ء کی چوری کا اعلان کیا اور بڑے ادب کے ساتھ معذرت بھی چاہی۔ نکتہ یہ ہے کہ جناب حکیم محمد احسن صاحب نے راز افشا نہیں کیا اور جناب محترم حکیم پیر غلام محی الدین صاحب نے میری شرارت کو معاف کر دیا مگر میں جب غور کرتا ہوں تو ایسا شرمندہ ہوتا ہوں اور نادم ہوتا ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔ چوری واقعی بُرائی ہے۔ ایسی شرارت کسی طرح بھی اچھی نہیں ہو سکتی۔ اب جب بھی اس شرارت پر غور کرتا ہوں تو پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ ساری عمر میں اپنی اس غلطی کو یاد رکھوں گا اور شرمسار رہوں گا۔

بچپن کی باتیں

یوں کہنا چاہیے کہ شرارتوں کا آغاز ڈھائی تین سال کی عمر سے ہو گیا تھا۔ میں ایک سفر میں محترمہ آپا صاحبہ (والدہ محترمہ، رابعہ بیگم) کے ساتھ تھا۔ محترمہ خالہ فاطمہ بھی ہم سفر تھیں۔ دہلی سے ریل گاڑی میں بیٹھے۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ خالہ فاطمہ کے برقعے میں غائب ہو گیا۔ خیال تھا کہ میرا ٹکٹ نہیں لگے گا۔ بڑے اطمینان سے مراد آباد اترے۔ ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب لینے آئے تھے۔ محترمہ آپا اور محترمہ خالہ نے اپنے ٹکٹ دیے اور باہر چلی گئیں۔ میں ان کے پیچھے چلا۔ ٹکٹ کلکٹر ایک کالی میم تھی۔ اس نے مجھے روک لیا۔ اب میں پلیٹ فارم کے اندر اور میری دونوں خواتین باہر۔ ''تم لوگ بچہ کا ٹکٹ کیوں نہ لیا؟'' اسے سمجھایا کہ ابھی تین سال کا نہیں ہے، مگر وہ اس بیان پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔ آخر میم جو تھی۔ میم جب کالی ہو تو بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ میں نے رونا شروع کر دیا۔ خوب رویا۔ مجھے اب تک اپنی چیخ پکار یاد ہے آخر میم نے دس بارہ آنے لے کر مجھے آزاد کیا۔

میں خاصا بگڑا ہوا تھا۔ خیر جناب ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب نے ہمیں یکے میں سوار کیا۔ ان کے گھر جا کر اترے۔

گھر کے اندر قدم رکھا تو چاروں طرف بڑا عجیب منظر تھا۔ ایک طرف ایک گائے اور ایک بھینس کا سائبان۔ دوسری طرف صحن اور پھر کمرے۔ دیکھا کہ سائبان کے قریب صحن میں محترمہ خالہ صغریٰ بیٹھی کچھ کر رہی ہیں۔

ان کے سامنے مٹی کا ایک بڑا گھڑا۔ گھڑا لکڑی رکابی سے ڈھکا ہوا مگر درمیان میں گول سوراخ۔ اس گول سوراخ میں ایک لکڑی پڑی ہوئی اور اس گول لکڑی میں رسّی پڑی ہوئی۔ رسّی کا ایک سرا خالہ صغریٰ کے ایک ہاتھ میں، دوسرا سرا دوسرے ہاتھ میں اور خالہ ہیں

کہ بڑے اطمینان سے رسّی کو چکر دے رہی ہیں اور گول لکڑی خوب گھوم رہی ہے۔ اس سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہو رہی ہے۔

میں اس دلچسپ منظر کو بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ بڑے انہماک سے غور کرتا رہا۔ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ چھل چھل کیا ہے۔ مٹکے کے اندر کیا ہے۔ یہ گول لکڑی کیا ہے۔ اس کا ایک سرا باہر ہے اور ایک مٹکے کے اندر کیوں ہے۔ کیا ہے؟

ہماری آپا اور خالہ کو دیکھ کر خالہ صغرا اٹھیں۔ بڑے تپاک سے ملیں۔ بڑی محبت تھی ان میں۔ میں ان سے تپاک سے ملا۔ فارغ ہو گیا اور ادھر خالہ صغریٰ اپنی دونوں بہنوں کو لے کر اندر گئیں۔ ادھر مجھے موقع مل گیا۔ میں مٹکے کا راز دریافت کرنے باہر آ گیا۔ جھٹ پٹ خالہ صغریٰ کی جگہ بیٹھ گیا۔ رسّی کے دونوں سرے اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھالے اور جس طرح خالہ صغریٰ دونوں ہاتھ چلا رہی تھیں، میں نے بھی چلائے۔ خوب زور زور سے۔ ایک بار تو لکڑی کی رکابی اچھل پڑی۔ اس کے ساتھ سفید دودھ بھی۔ اچھا تو دودھ ہے! بھئی یہ دودھ اس قدر گاڑھا کیوں ہے؟

تحقیق مزید کے لیے میں نے اپنے ہاتھ روک کر اس گاڑھے سیال کو چکھا۔ اس میں تو دہی ہے۔ دودھ کہاں؟ اور یہ گھی گھی سا کیا ہے؟ میں نے لکڑی کی رکابی پر جمی ہوئی سفید کاہی کو چکھا۔ یہ تو اچھا خاصا مکھن ہے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ سامنے نگاہ کی تو دونوں گائے اور بھینس مجھے غور سے گھور رہی تھیں۔ وہ بندھی ہوئی تھیں۔ ان سے مجھے کوئی ڈر خوف نہ تھا۔

بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے مزید سمجھنے کے لیے لکڑی کی رکابی مٹکے پر پھر رکھ دی اور ذوق و شوق سے دونوں سرے سنبھالے اور زور و شور سے دونوں ہاتھ چلائے۔ موٹی گول لکڑی کبھی دائیں گھومتی اور کبھی بائیں۔ چھل چھل کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لکڑی کی رکابی الٹ پلٹ ہو رہی تھی۔

ابھی یہ معاملہ جاری تھا۔ میں اور زور میں آیا۔ اب میں نے زیادہ تیزی کے ساتھ لکڑی کو گھمانا شروع کر دیا۔ یکا یک زوردار آواز ہوئی۔

کھٹاک!

ادھر کھٹاک ہوئی کہ ادھر میں نے دیکھا کہ مٹکا پھوٹ گیا ہے اور اس میں سے گاڑھا سیال بہہ نکلا ہے۔

کھٹاک کی آواز خالہ صغرا کے دل پر جا کر لگی۔ بھاگم بھاگ وہ آئیں، مگر میں تو اپنا کام کر چکا تھا۔ مٹکا پھوٹ چکا تھا۔ خالہ صغرا نے جو مٹکے میں بچا تھا اسے سنبھالا۔ میں وہاں سے اٹھ کر اندر چلا گیا اور خالہ فاطمہ کی گود میں جا کر بیٹھ گیا۔ خالہ صغرا نے مجھے کچھ نہ کہا۔ ہاں ڈاکٹر فضل صاحب نے اپنی سفید و سیاہ نگاہوں سے گھورا جس کی تاب نہ لا کر میں اپنی خالہ فاطمہ کی گود میں پناہ لے چکا تھا۔ اندر کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ باہر کیا حادثہ پیش آچکا ہے۔ باہر سے خالہ صغرا اندر آئیں۔ انھوں نے ایک لفظ پھر بھی نہ کہا۔ بس یہ کہا:

"چلو بھئی رابعہ اور بھئی فاطمہ ناشتا کرتے ہیں۔ میں نے بڑی اچھی چھاچھ تیار کی ہے مگر وہ ذرا کم پڑے گی، ذرا بہہ گئی ہے۔ مگر پھر بھی تمھارا دل خوش ہو جائے گا یہ چھاچھ پی کر۔"

اب مجھے پتا چلا کہ مٹکے اندر چھاچھ تیار ہو رہی تھی۔ یہ چھاچھ کیا ہے۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔ بات بالآخر کھل گئی۔ محترمہ آپا صاحبہ کو معلوم ہو گیا کہ میں نے کیا حرکت کی ہے۔ تنبیہ تو خوب کی، مگر میرا اشتیاق بھی عجیب تھا۔ میں یہی پوچھتا رہا: "آپا جی! اس میں کیا تھا؟" انھوں نے اب مجھے سمجھایا:

"یہ سامنے جو گائے ہے وہ دودھ دیتی ہے۔ بھینس بھی دودھ دیتی ہے۔ یہ تازہ دودھ ہوتا ہے۔ اس دودھ کو گرم کر لیتے ہیں۔ پھر ٹھنڈا کر کے اس میں ذرا سی دہی ملا دیتے ہیں۔ مٹکے کو پھر بھر کر اسے ٹھنڈ میں رکھ دیتے ہیں۔ سارا دودھ دہی بن جاتا ہے۔ صبح اس مٹکے میں بلونی ڈالتے ہیں۔ بلونی کا نیچے کا حصہ تم نے دیکھا۔ پھول سا بنا ہوا ہے۔ جب رسّی سے اسے چلاتے ہیں تو اسے بلونا کہتے ہیں۔ خالہ صغرا دہی بلو رہی تھیں۔ وہ پوری احتیاط سے یہ کام کر رہی تھیں۔ تم نے احتیاط نہیں برتی اور لکڑی کا پھول مٹکے کی دیواروں سے ٹکرا گیا اور مٹکا ٹوٹ گیا اور بڑا نقصان ہو گیا۔

"ہاں تو جب کافی دیر بلو لیتے ہیں اور دہی ٹوٹ کر نرم اور یک جان ہو جاتا ہے تو اس میں ٹھنڈا پانی ڈالتے ہیں اور پھر بلوتے ہیں، بلوتے ہیں، یہاں تک کہ اس میں دہی سے اوپر مکھن آ جاتا ہے۔ بلوتے رہتے ہیں۔ ذرا ذرا سا ٹھنڈا پانی ڈالتے رہتے ہیں۔ مکھن نکلتا رہتا ہے جب سب مکھن الگ ہو جاتا ہے تو مٹکے میں جو چیز باقی رہ جاتی ہے اسے چھاچھ کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے ساور ملک (ترش دودھ) کہتے ہیں۔"

محترمہ آپا صاحبہ نے فرمایا کہ یہ چھاچھ نہایت نفیس اور لطیف چیز ہے۔ یہ جگر کے لیے بڑی فائدے مند غذا ہے۔ جگر اسے بڑی خوشی سے قبول کرتا ہے اور پلک جھپکتے اسے ہضم کر ڈالتا ہے۔ پھر اس سے نہایت صاف خون تیار ہوتا ہے۔ اس صاف خون سے صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ مکھن جگر کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔

اتنا فرما کر محترمہ آپا صاحبہ نے مجھے سمجھا کر خالہ صغرا کے پاس بھیجا تاکہ میں ان سے اپنی غلطی کی معافی مانگوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور نہایت ادب سے معافی مانگ لی۔ انھوں نے پیار کر کے معاف کر دیا مگر میں شرمندہ ضرور رہا۔

اب ایک لطیفہ بھی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

دہی سے بھرا مٹکا تیار رکھا تھا۔ اب اسے کوئی بلونے والا ہی تھا کہ دو مینڈک آپس میں چہل کرتے، ہنسی مذاق کرتے آئے اور دھڑام سے مٹکے میں جا گرے۔ توبہ ہے اللہ! اب کیا ہو۔ اب لگا ان کو ایسا کہ اب ڈوبے اور اب ڈوبے۔ ان کے لیے تو یہ دہی دلدل تھی۔ دلدل نہایت ہی گاڑھی مٹی ہوتی ہے۔ اس میں آدمی چلا جائے تو وہ دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ نکل نہیں سکتا۔ جتنا ہاتھ پیر مارتا ہے نیچے اترتا چلا جاتا ہے۔

خیر صاحب! ہوا یہ کہ ان دونوں مینڈکوں نے بڑے زور زور سے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے۔ مارتے رہے ہاتھ پیر۔ یہاں تک کہ ایک مینڈک تھک گیا۔ ہار گیا اور دہی کی دلدل میں ڈوب گیا۔

مگر دوسرے مینڈک نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ ہاتھ پیر کیا مارتا رہا، دہی کو بلوتا رہا، بلوتا رہا اب جو دیکھا تو دہی سے مکھا الگ ہو گیا۔ مکھن کا ایک تھکا سامنے آ گیا۔ یہ مینڈک

کی محنت سے بنا تھا۔ اب مینڈک نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پھدک کر اس مکھن کے تھکے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اب اس نے اور ہمت کی۔ ایک بار اور زور سے پھدکا۔ اس زور سے کہ کود کر مٹکے سے باہر آ گرا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

ایک مینڈک جس نے مشکل میں پھنس کر ہمت ہار دی وہ ڈوب گیا اور جس نے ہمت نہ ہاری وہ اچھل کر خطرے سے باہر آ گیا۔

پھر اللہ کا کرنا کیا ہوا؟ محترمہ آپا صاحبہ نے فیصلہ کیا کہ ایک بھینس خریدی جائے۔ یہ بھینس خریدی گئی اور ہمارے کوچہ کاشغری کے مکان میں وہ آ کر بندھی۔ اس کا دودھ دوہا جاتا۔ دہی جمتا۔ دودھ دوہنے کا کام آپا صاحبہ کرتی تھیں۔ اس زمانے میں تو دونوں انگوٹھے پلٹ کر ان کے دباؤ سے دودھ دوہا جاتا تھا۔ اب تو دودھ دوہنے کی ویکیوم مشینیں آ گئی ہیں۔ خیر ہمارے ہاں بھی دہی بلویا جاتا۔ میری بڑی بہن، محترمہ حمیدی بیگم اور محترمہ محمودہ بیگم (والدہ حکیم یٰسین) دہی بلویا کرتی تھیں مگر میں بھی نہ چوکتا۔ ذرا آنکھ بچی اور میں مٹکے پر سوار اور بلونی کی رسیاں میرے ہاتھ میں، مگر میں نے پھر کبھی مٹکا نہیں توڑا۔

بچپن کی یادیں

جب میں تین سال سے ذرا کم عمر میں محترمہ استانی جی (چچی جان) کے ہاں ناظرہ قرآن حکیم پڑھنے کے لیے بٹھایا گیا تو وہاں کا ماحول بڑا دلچسپ تھا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ پہلے دن جب وہاں پہنچا تو گھر کے صحن میں جمنا کی بڑی چمکتی ریت جمع تھی۔ ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ریت نم تھی۔ دوسرے بچوں کے ساتھ میں بھی ریت سے کھیلنے لگا۔ ریت میں پیر دبا کر مکان بنانا تعمیر کا دلچسپ مشغلہ تھا اور خوب تھا۔ نرم ریت میں پیر ڈالا۔ اوپر سے مزید ریت جمائی، تھپ تھپایا، پیر نکال لیا۔ اندر خلا رہ گیا۔ لیجیے، گویا مکان بن گیا۔ میں نے دیکھتے ہی دیکھتے ریت کے ڈھیر کے چاروں طرف کئی مکان بنا ڈالے۔ خیر! ابتدا اس طرح تعمیری جدوجہد سے ہوئی۔

اس گھر میں ڈھیر سارے کبوتر تھے، زیادہ تر سفید! استانی جی (چچی جان) اور چچا جان دونوں کبوتروں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ رات کی باسی روٹیاں صبح دونوں میاں بیوی لے کر بیٹھ جاتے اور ننھے ننھے ٹکڑے کر کے کبوتروں کے آگے ڈالتے۔ کبوتر بڑے شوق سے کھاتے۔ مجھے یہ منظر بڑا ہی بھاتا تھا۔ جلد ہی یہ کام میں نے بھی شروع کر دیا اور کبوتر مجھ سے خاصے مانوس ہو گئے۔

ایک دن اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ چچی جان دورے پر نکل گئیں اور چچا جان تھانہ حوض قاضی ڈیوٹی پر۔ گھر میں بہت سارے بچے اور بچیاں میری ہم جماعت۔ میں گویا مانیٹر! نہ جانے کیا دل میں آئی کہ سیڑھی لگا، میں کبوتروں کی کابک میں پہنچ گیا اور اندر گھس کر سب سے زیادہ خوبصورت موٹے سے کبوتر کو اپنے ننھے ہاتھوں میں دبوچ لیا اور لگا پیار کرنے۔ وہ بڑا طاقتور نکلا۔ زور مارا اور میرے ہاتھ سے نکل گیا اور دم اس کی میرے ہاتھ میں رہ گئی۔

اس صورت حال نے تین کیفیتیں بہ یک وقت پیدا کیں۔ ایک: کبوتر کی تکلیف کہ اس کی پوری سفید دم میرے ہاتھ میں رہ گئی اور وہ بغیر دم کے رہ گیا۔ دوسرے: خوف کہ چچی جان اور چچا جان پوچھیں گے تو کیا جواب دوں گا۔ اس حادثے کے عینی گواہ ۱۵۔ ۱۶ بچے تھے۔ تیسرے: ناکامی کہ کبوتر ہاتھ سے نکل گیا۔

رات گزر گئی۔ صبح جب ماموں فضل استانی جی کے ہاں چھوڑنے آئے تو چچا چچی دونوں کبوتروں کو دانہ چکا رہے تھے۔ ان میں بے دم کبوتر بھی تھا! اسے دیکھ کر ایک بار تو میرا دم ہی نکل گیا۔

''سعید بیٹے! اس کبوتر کی دم کو آخر کیا ہو گیا؟''

میرے قریب جا کر بیٹھتے ہی چچا جان نے سوال کیا۔ میں نے گہرا سانس لیا اور پھر حقیقت جو گزری تھی سچ سچ بیان کر دی۔ اس سچ پر چچی جان کا تاثر یہ تھا کہ ''کیسا نڈر ہے، منہ در منہ باتیں کر رہا ہے۔'' مگر چچا جان کے تاثرات بالکل مختلف تھے۔ میری سچائی پر وہ واقعی خوش ہوئے اور صرف یہ کہا کہ کبوتر کو تکلیف ہوئی ہے۔ ایسا ہونا برا ہوا۔ یہ افسوس تو خود مجھے بھی تھا۔ چچی جان نے بہر حال کئی پابندیوں میں جکڑ دیا جس سے میرے دل میں بغاوت پیدا ہوئی۔

ادھر جب میں ذرا بڑا ہوا اور ناظرہ قرآن ختم کر کے پانچ سال کی عمر میں حافظ سید عمر دراز علی صاحب کے ہاں حفظ قرآن کے لیے بٹھایا گیا تو وہاں کبوتروں کا شوق اٹھا۔ آپا (محترمہ والدہ صاحبہ) نے کوئی ممانعت نہیں کی اور گھر میں کئی جوڑے کبوتر آ گئے۔ پھر شوق بڑھا، کابلی، گولے، شاورے، لقا، یاہو، شیرازی غرض کئی قسم کے کبوتروں سے گھر بھر گیا۔

شوق یہاں ختم نہ ہوا۔ جب ۹ سال کی عمر میں قرآن کا حافظ بن گیا تو کبوتروں کی تعداد ہزار تک جا پہنچی۔ اب میں کبوتروں کی ٹکڑیاں اڑانے بھی لگا۔ یہ ایک فن ہے۔ میں دس سال کی عمر میں اس فن میں طاق تھا۔

گذشتہ دنوں نیو یارک ٹائمز کا ایک مضمون نظر سے گزرا، کبوتروں پر تھا۔ اسے میں نے غور سے اس لیے پڑھا کہ فن کبوتر بازی پر ایک نوٹ تیار کروں گا کہ ایک اخبار میں ان

دنوں بالاقساط فن کبوتر بازی پر سلسلہ مضامین شروع ہو گیا ہے جسے میں دلچسپی سے پڑھ رہا ہوں۔ خیال یہ ہے کہ مدینۃ الحکمہ میں اچھے کبوتر بھی ہونے چاہئیں۔

شہسواری

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں! میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے میرے گھوڑے موتی نے کئی بار پٹخ دیا ہے۔ یہ میری ۱۲۔ ۱۳ سال کی عمر کی بات ہے۔ گھڑ سواری کا میرا خاص لباس تھا۔ خاکی برجس، اس پر پنڈلیوں تک چمڑے کے موزے، خاکی کوٹ، فل بوٹ اور اس میں ایڑھ بندھی ہوئی۔ موتی نہایت شریر تھا۔ وہ دیکھنے میں بھی معصوم نہ تھا۔ جب بگڑتا تو ہنگامہ کر دیتا۔ اس کی پیٹھ پر زین کسنا مذاق نہ تھا۔ اس کے منہ میں لگام دینا بھی آسان نہ تھا۔ وہ اس سے ناراض ہوتا۔ جب وہ یہ دیکھتا کہ ایک چھوٹا سا لڑکا خاص لباس پہنے چلا آ رہا ہے تو وہ گویا اس طرح ہنہناتا جیسے ہنس کر میرا مذاق اڑا رہا ہو۔ اس کے ہنہنانے سے بے پروا ہو کر میں بڑے ٹھاٹھ سے سوار ہوتا۔ شروع میں موتی بڑی شرافت برتتا، مگر جب دوڑانے کے لیے میں ایڑھ لگاتا تو وہ بدک جاتا تھا۔ بدک کر الف ہو جاتا۔ اس نے ناراض ہو کر کئی بار بلکہ بارہا مجھے زمین پر پٹخ دیا مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور آخر شہسوار بن گیا۔ موتی نے مجھے قبول کر لیا تھا۔ شہسواری بھی کیا تفریح ہے اور کیسی اچھی ورزش ہے۔ اب بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہ ورزش کروں، مگر وقت کہاں سے لاؤں۔

موٹر ڈرائیونگ

موٹر چلانا میرا بچپن کا شوق ہے۔ سچ پوچھیے تو لاکھوں میل موٹریں بھگا چکا ہوں۔ میں ابھی تیرہ سال کا تھا کہ ماہر موٹر ڈرائیور بن چکا تھا۔ میرا ڈرائیونگ لائسنس ۱۹۳۳ء کا ہے۔ ہندستان میں بھی موٹر خوب چلائی۔ ۱۹۴۷ء میں دہلی کے ہنگاموں میں، میں نے دہلی سے پاکستان جانے والوں کی بڑی خدمت کی۔ مارا ماری اور قتل و غارت میں ان کو ہوائی میدان پہنچانے کی خدمت میں نے اپنے ذمے لے لی تھی۔

پاکستان میں کوئی تیس سال موٹر چلاتا رہا۔ یورپ میں بھی چلائی اور خوب دوڑائی۔ لو بچو! ایک حادثہ سنو۔ میں، بڑے بھائی جان (حکیم عبدالحمید) اور ڈاکٹر برکات احمد، ہم تینوں انقرہ سے سڑک کے راستے استنبول روانہ ہوئے۔ ظاہر ہے کہ موٹر میں چلا رہا تھا۔ ترکی میں ''کیپ رائٹ'' (دائیں جانب رہو) ہے جبکہ پاکستان، ہندستان میں کیپ لیفٹ ہے۔ میں بڑی تیز موٹر چلا رہا تھا۔ صاف چوڑی سڑک تھی۔ رفتار ۶۵۔۷۰ میل فی گھنٹہ تھی۔ باتوں باتوں میں بھول گیا اور دائیں کے بجائے بائیں جانب آ گیا۔ ادھر سامنے سے ایک بس تقریباً اسی رفتار سے اپنے دائیں آ رہی تھی۔ میں بائیں تھا۔ بس ہم دونوں کا سامنا ہو گیا۔ رفتار دونوں کی تیز، فاصلہ آنکھ جھپکتے طے ہو گیا اور میری کار اور بس دونوں آمنے سامنے آ گئے اور ایک دفعہ ہی ہم دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہوئے۔ آپس میں ٹکر بھی ہوئی۔ میری کار اچھل کر دریائے مارمرا کی طرف جا گری۔ وہاں ایک پول نے ٹکرا کر کار کو دریا میں گرنے سے روک دیا۔ ذرا ہوش آیا تو میں بھی سڑک پر تھا اور دیکھا تو بس بھی سڑک پر تھی۔ میرا رخ استنبول کی طرف تھا اور بس کا رخ انقرہ کی طرف۔

چند سیکنڈوں میں سارا حادثہ گزر گیا۔ کوئی تین میل چل کر حواس ٹھکانے ہوئے۔ اب غور کیا تو میرے دائیں ہاتھ کی چاروں انگلیاں اتر چکی تھیں۔ استنبول پہنچا تو خاصا تیز بخار تھا۔ ایسے حادثوں کا کوئی حساب نہیں ہے۔ میں نے حادثوں سے ہمیشہ زور آزمائی کی ہے۔

موٹر سائیکل

میں نے زندگی میں ایک بار بھی بائیسکل نہیں چلائی ہے۔ ہاں بہت بچپن میں تین پہیوں سائیکل ضرور چلائی۔ اب جبکہ میں ۱۳۔۱۴ سال کا تھا تو موٹر سائیکل کا شوق ہوا۔ ایک استاد کی خدمات حاصل کیں اور دہلی میں جمنا کے کنارے بیلا روڈ پر موٹر سائیکل چلانی سیکھی۔ بچے جانتے ہیں کہ موٹر سائیکل میں نکل کا چمک دار سائلنسر ہوتا ہے۔ اس سے انجن کا دھواں باہر خارج ہوتا ہے۔ یہ سخت گرم ہوتا ہے۔ ایک بار بے قابو ہوا تو میری پنڈلی اس گرم سائلنسر پر جا کر چپک گئی اور پوری کھال پنڈلی سے اتر کر سائلنسر پر چپک گئی۔ میری

پنڈلی پر یہ داغ آج بھی ہے۔

بھائی جان محترم سے چھپواں موٹر سائیکل سیکھنے کا سلسلہ جاری رہا اور آخر کار مہارت پر ختم ہوا۔ میں نے اس نئے شوق کو بھائی جان محترم سے راز رکھا تھا، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ بھائی جان کوٹھی نمبر ۱۰ دریا گنج سے مجھے روز بیلا روڈ پر دیکھا کرتے تھے، مگر ایک دن بھی انھوں نے جواب طلبی نہ فرمائی۔

پہلے ڈھائی ہارس پاور کی بی ایس اے موٹر سائیکل لی، پھر پانچ ہارس پاور کی ایری میل ریڈ ہنٹر اور پھر دس ہارس پاور کی انڈین۔ بڑا قابو تھا۔ خوب دوڑاتا تھا۔ موڑ پر کمال یہ تھا کہ دونوں پیڈل زمین سے ٹکراتے اور گھس جاتے تھے۔ کیا مزہ آتا تھا! پھر لانگ جمپ کا شوق ہوا تو مشق کرتے کرتے موٹر سائیکل کو ۱۷۔۱۸ فٹ جمپ کرانے لگا اور جب دہلی میں سرکس آیا تو ''موت کے گولے'' میں بھی موٹر سائیکل چلانے سے باز نہ آیا۔ واہ وا کیا زمانہ تھا۔ کیسے بھول جاؤں اس سب کو!

گاما۔ رستمِ زماں

کھلنڈرا ہونا بُری بات نہیں ہے۔ کھیل کود اچھا ہے۔ یہ ایک جسمانی ورزش ہے اور جسم و روح کے لیے ضروری ہے۔ نونہالوں کے لیے اور نوجوانوں کے لیے ہر ملک میں اور ہر جگہ ورزش کا اہتمام کیا جاتا ہے اور کھیل کے میدان بنائے جاتے ہیں۔ دنیا کے ذہین دماغ نئے نئے کھیل ایجاد کرتے ہیں۔ دلچسپی کے نئے نئے راستے کھولتے ہیں۔ کھیل ورزش بھی ہوتے ہیں اور کھیل تربیت بھی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر فٹ بال کو لیں۔ گیارہ آدمی اِدھر اور گیارہ اُدھر۔ دو ٹیمیں ہیں اور ایک گیند ہے۔ اب مقابلہ ہے۔ ایک ٹیم کے گیارہ آدمی دوسری ٹیم کے گیارہ آدمیوں کو اس طرح جیتنا چاہتے ہیں کہ ان کے گول کے اندر فٹ بال پھینک دیں، جو ٹیم زیادہ فٹ بال گول میں پھینکے گی وہی جیت جائے گی۔

اب ذرا غور کریں۔ اس کھیل میں کس قدر بھاگ دوڑ ہے۔ کتنے داؤ پیچ ہیں۔ کس قدر ذہنی ورزش ہے۔ کس قدر جذبہ ہے۔ کس قدر شوق ہے۔ سب سے زیادہ یہ کہ کس قدر "ٹیم ورک" ہے یعنی گیارہ ایک طرف کے آدمی ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ گیند کو گیارہ کے گیارہ اپنی مشترک کوششوں سے گول میں پھینکتے ہیں۔ اگر ایک طرف کے گیارہ آدمی ایک دوسرے کی بھرپور مدد نہ کریں، ایک دوسرے سے بھرپور تعاون نہ کریں، اتفاق نہ کریں تو گیند کو گول میں پھینک ہی نہیں سکتے۔ فٹ بال درحقیقت ایک سبق ہے۔ سبق یہ ہے کہ ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ ایک دوسرے کی مدد کریں اور مقصد (گول) حاصل کریں۔

اسی طرح دوسرے کھیل بھی ہیں: ہاکی، کرکٹ وغیرہ

میں نے فٹ بال کی مثال اس لیے دی کہ میں خود فٹ بال کا کھلاڑی رہا ہوں۔ پہلے

ہمدرد فٹ بال ٹیم بنائی۔ اس ٹیم نے بڑے مقابلے کیے۔ شروع میں یہ نونہالوں کی ٹیم تھی۔ بعد میں یہ نوجوانوں کی ٹیم بنی۔ اس دوران میں دہلی ینگو کا ممبر بن گیا۔ یہ بڑے پایے کی فٹ بال ٹیم تھی۔ پھر اس دہلی ینگو کے بعض کھلاڑی ہندستان کی مایہ ناز فٹ بال ٹیم "محمڈن اسپورٹنگ" میں چلے گئے۔ مثلاً حافظ رشید۔ میں بھی اعزازی ممبر بن گیا۔ حافظ رشید ابھی زندہ ہیں۔ اپنے وقت میں ہندستان کے بہترین سینٹر فارورڈ تھے۔ بڑے بڑے سورما انگریز فٹ بال کے کھلاڑی ان سے ڈرتے تھے۔ حافظ رشید کو جہاں گیند ملی کہ گول ہو گیا۔ ان کو گیند ملتے ہی مخالف ٹیم کے کھلاڑی حافظ رشید پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ماشاء اللہ۔ فٹ بال کی دنیا میں حافظ رشید کا بڑا شہرہ رہا۔ آخر ایک بار حافظ جی غچہ کھا گئے۔ چوک ہو گئی۔ ایک انگریز فٹ بال (غالباً گرین ہاورڈ ٹیم) کے کھلاڑی نے گیند پر کک ماری اور ان کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد وہ فرسٹ کلاس فٹ بال نہیں کھیل سکے۔ ہمارے ملک کے خاص حالات میں ہمارے لیے فٹ بال بہت اچھا کھیل ہے اور ہاکی بھی خوب ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ہمارے ہر شہر میں اور ہمارے ہر گاؤں میں فٹ بال اور ہاکی کے لیے بہت سارے میدان ہوں اور نونہال اور نوجوان ورزش کے لیے آزاد ہوں۔

لو بھئی میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ بات شروع یوں ہوئی تھی کہ کھیل کود اچھا ہے۔ صحت کے لیے ضروری ہے۔ تندرستی کے لیے ورزش کرنی چاہیے لیکن ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہیے۔ فقط کھیل کافی نہیں ہے۔ نونہال اور نوجوان دونوں کو پڑھنا بھی چاہیے۔ خوب پڑھنا چاہیے۔ کھیل کو حد کے اندر ہونا چاہیے۔ دل لگا کر پڑھنا چاہیے۔ صحت اچھی ہو تو پڑھنے میں دل لگتا ہے۔

نونہالو! ذرا مجھے دیکھو کہ میں خود غچہ کھا گیا۔ میرے رفیق اور دوست مسعود احمد برکاتی نے مجھے لکھا: "ازراہِ کرم گاما سے ملاقات کا مختصر حال لکھ کر دے جائیے گا۔ جون کے آغاز میں نونہال کا خاص نمبر حوالۂ پریس کرنا ہے۔"

گاما سے ملاقات کا حال مجھے لکھنا تھا۔ بات کھیل کود سے شروع ہوئی اور فٹ بال تک چلی گئی۔ بات تو گاما کی کرنی تھی۔ خیر، بات دراصل یہ ہے کہ گاما ہماری ایک بہت بڑی

شخصیت کا نام ہے۔ نام تو غلام محمد تھا، مگر مشہور ہوئے گاما جی کے نام سے۔

اا رستمبر ۱۹۱۰ء کے اخبار ''ٹائمز'' لندن میں گاما سے زبسکو کی کشتی کا حال لکھا ہے۔ زبسکو بھی اپنے وقت کا بہت طاقتور انسان تھا۔ وہ پہلی بار ریاست پٹیالہ میں گاما سے ہار چکا تھا۔ بڑے معرکے کی کشتی تھی۔ ہندستان کا وائسرائے بھی اس کشتی میں شریک ہوا تھا۔ گاما کی اس فتح کے بعد بڑی شہرت ہوئی۔ پھر لفظ گاما تو ہماری عام بول چال میں آ گیا۔ گاما کے معنی طاقتور انسان ہو گئے۔ لندن میں جب گاما اور زبسکو اکھاڑے (ایرینا) میں اترے تو دونوں زبردست طاقت کے مالک تھے۔ دو پہاڑ تھے جو ٹکرانے والے تھے۔ بڑی خلقت جمع تھی۔ لندن کے اخبارات خبروں سے بھرے پڑے تھے۔ بھئی ہوا یہ کہ جب گاما اور زبسکو آمنے سامنے آئے، گاما نے یا علی کا نعرہ لگایا۔ خلقت نے یہ دیکھا کہ ان دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔ شیک ہینڈ ہوا۔ دوسرے لمحے گاما نے بھاری بھرکم جن کو ہوا میں دس بارہ فٹ اچھال دیا اور پھر دیکھا تو زبسکو چاروں خانے چت اور گاما اس کے سینے پر سوار۔ نعرہ لگایا: اللہ اکبر!

نونہالو! میں نے زبسکو کو خط لکھا۔ مجھے زبسکو نے جو جواب دیا اس میں لکھا کہ ''گاما بڑا انسان ہے۔ دنیا کا سب سے طاقتور آدمی ہے۔ تعریف کے لیے میرے پاس موزوں الفاظ نہیں ہیں۔'' اس کے بعد گاما نے رستم زماں کا لقب پایا۔ جب تک وہ زندہ رہے، رستم زماں رہے۔

اب کہانی شروع ہوتی ہے۔ میں جب تین سال کا تھا تو حویلی رضیہ بیگم میں قرآن حکیم پڑھنے کے لیے ایک استانی جی کے ہاں بٹھا دیا گیا۔ وہ جگت چچی جان تھیں۔ اس محلے میں ایک اکھاڑا تھا۔ میں صبح و شام دیکھتا تھا۔ پہلوان یہاں ورزش کرتے تھے۔ ڈنٹر پیلتے تھے۔ بیٹھکیاں لگاتے تھے۔ چکنی مٹی کا اکھاڑا تھا۔ اسے تیل بھی پلایا جاتا تھا۔ مجھے بڑا مزہ آتا تھا۔ میری عمر چھے سال کی ابھی نہیں ہوئی تھی کہ میں نے قرآن شریف ناظرہ ختم کر لیا۔ چچا جان (حولدار رحیم بخش) نے گاڑی بان والی اونچی مسجد میں حفظ قرآن کے لیے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ حافظ سید عمر دراز علی صاحب نے قرآن شریف حفظ کرانا شروع کر دیا۔ خیر

راستہ وہی تھا۔ اکھاڑے کی طرف سے روز ہی گزر ہوتا۔ مجھے پہلوان بننے کا شوق ہو گیا۔ مجھے پہلوانوں کا انداز پسند تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پہلوانوں کی بڑی عزت تھی۔ گاما جی نے اس فن کو آسمان پر پہنچا رکھا تھا۔ گاما جی سے بھی مجھے خوب دلچسپی تھی۔ سات سال کی عمر تھی کہ میں حج بیت اللہ کو چلا گیا۔ بھئی کیا مزے دار سفر تھا۔ اس سفر حج کا ایک ایک لمحہ آج بھی یاد ہے۔ ذرا نونہال غور کریں۔ آج کل حال یہ ہے جدہ اور مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہوائی جہاز میں بس ۲۵۔۳۰ منٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔ سڑکیں لاجواب ہیں۔ موٹر کار تین ساڑھے تین گھنٹے میں پہنچا دیتی ہے۔ ۱۹۲۷ء میں مکے سے مدینے میں سترہ دن میں پہنچا تھا۔ اس زمانے میں سفر اونٹوں پر ہوتا تھا۔ اونٹ رات بھر چلتے تھے۔ ان کو کسی سایے میں پڑاؤ کرنا پڑتا تھا۔

خیر بھئی نو سال کا ہوا تو میں نے قرآن شریف حفظ کر لیا۔ بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ بڑی شاندار تقریب ہوئی۔ تیرہ سال کی عمر میں تراویح میں پورا قرآن فرفر سنا دیا۔ بس تین غلطیاں ہوئیں۔ بڑی شاندار رات تھی۔ تانبے کی تشتریوں میں بالوشاہی تقسیم ہوئی۔ خلقت ٹوٹی پڑتی تھی۔ کئی لوگ تو مسجد حوض قاضی کے حوض میں گر گئے۔

ورزش کا شوق مجھے بھی ایک دن اکھاڑے میں لے گیا۔ استاد نے کہا: ''صبح آ کر پھاوڑے سے اکھاڑا کھودا کرو!'' یہ بڑا مشکل کام تھا۔ اکھاڑے کی چکنی تیل دار مٹی بڑے بڑے موٹے موٹے پہلوانوں کی لڑنت سے بس جم ہی جایا کرتی تھی۔ صبح اسے نرم کرنے کے لیے کھودنا پڑتا تھا۔ پہلوانی کا پہلا سبق یہاں سے شروع ہوا۔ پھر ڈنٹر پیلنے سکھائے گئے۔ بیٹھکیاں لگانی شروع کیں۔ یہ اکھاڑا زیادہ مشہور نہیں تھا۔ استاد ماہ رخ بیگ کا بڑا شہرہ تھا۔ ان کے اکھاڑے میں بھی لڑنت کا موقع ملا۔ ان دنوں دلی میں دنگل خوب ہوا کرتے تھے۔ ہزارہا شوقین جمعہ کو دنگلوں میں جاتے۔ بڑی بڑی کشتیاں ہوتیں۔ میں بھی دنگل جاتا اور پھر ایک بار دنگل میں ایک کشتی بھی لڑ ڈالی جو برابر چھٹی۔

پتا چلا اور بات شہر شہر پھیل گئی کہ منگل سنگھ پہلوان نے رستم زماں گاما کو چیلنج کیا ہے۔ منگل سنگھ بڑے کلّے جبڑے کا پہلوان تھا۔ لگتا تھا کہ کیکر سنگھ کا شاگرد ہے۔ کیکر ایک درخت

کا نام ہے جس کی مسواک بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ایک دن ایک پہلوان آیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کیکر کے درخت کا تنا پکڑا اور درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ نام کیکر سنگھ پڑ گیا۔

تو بھئی گاما نے منگل سنگھ کو مسکرا کر جواب دیا۔ ''ذرا پہلے میرے بھانجے حمیدہ سے دو دو ہاتھ کرلو۔ پھر میرے بھائی امام بخش سے لڑنا۔ اس کے بعد مجھ سے بات کرنا۔'' منگل سنگھ تو بڑے زور میں تھا۔ اس نے سوچا کہ حمیدہ کو تو میں پیس کر رکھ دوں گا۔ ہاتھ مل گئے۔ معاملے طے ہوگیا۔ کشتی دہلی میں طے پائی۔

تاریخ تو مجھے یاد نہیں، یہ کشتی دہلی میں ہوئی لیکن گاما دہلی نہیں آئے، نہ امام بخش آئے۔ ہاں رحیم سلطانی اسی خاندان کے نامی گرامی بزرگ پہلوان تھے، وہ گاما خاندان کی نمایندگی کر رہے تھے۔ خیر جناب! اکھاڑے میں دونوں پہلوان اترے۔ پہلے منگل سنگھ اترے۔ بڑا ہی سڈول کالا چمکتا ہوا جسم، لمبا تڑنگا انسان، دیکھ کر ڈر لگے۔ اب یا علی کا نعرہ بلند ہوا۔ دھم سے حمیدہ اکھاڑے میں کودے۔ دیکھا تو بہت چھوٹا قد۔ جسم خوب گٹھا ہوا، مگر منگل سنگھ سے بہت کم۔ مسلمان تو سہم گئے۔ یہ تو شیر و بکری کا مقابلہ تھا۔ دنگل میں ایک بار تو سناٹا ہی چھا گیا۔ خیر صاحب، دونوں پہلوان آمنے سامنے ہوئے۔ دونوں نے ہاتھ ملائے۔ پلک جھپکی تو حمیدہ پہلوان سنگھ کی پشت پر تھا۔ ابھی پلک ایک اور جھپکی تو دیکھا کہ منگل سنگھ چاروں شانے چت پڑے ہیں اور حمیدہ ان کے سینے پر سوار ہے۔ دونوں ہاتھ بلند: نعرۂ تکبیر اللہ اکبر سے سارا دنگل گونج اٹھا۔

اس ناکامی کے بعد منگل سنگھ نے گاما خاندان کو کبھی چیلنج نہیں کیا۔ ہاں پھر گاما جی دہلی آئے۔ یہاں ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا: ''میں آپ سے کشتی لڑنا چاہتا ہوں۔'' وہ مسکرائے اور بڑے پیار سے ۱۱ سال کے محمد سعید سے کہا:

''نہ میاں کیوں میری عزت کے پیچھے پڑے ہو۔ میں ہارنا نہیں چاہتا۔''

بات آئی گئی ہوئی۔ میرا ورزش کا شوق قائم رہا۔ میں اکھاڑے جاتا رہا۔ اکھاڑا کھودتا رہا۔ لڑنت کرتا رہا۔ پہلوان بن گیا، مگر مشہور نہ ہوا۔ میں کیسے پہلوان بنتا۔ ماسٹر ممتاز حسین مجھے حساب پڑھانے آگئے۔ پھر ماسٹر اقبال حسین نے انگریزی، اردو کے لیے مجھے گھیر لیا۔

پھر دیکھا تو عربی و فارسی کے لیے مولانا قاضی سجاد حسین سر پر سوار ہو گئے۔ ان استادوں نے ہوش ٹھکانے کر دیے۔ میں نے ان استادوں کو کئی پہلوانی داؤں پر رکھا، مگر یہ بچ بچ گئے۔ ایک بار تو میں نے دھوبی پاٹ مارا، مگر یہ تڑی دے گئے۔ آخر میں نے شکست مان لی۔ پہلوانی چھوڑ دی، مگر گاما جی سے کبھی سال چھ مہینے میں ملاقات ہو جاتی تو میں ان کو چیلنج ضرور کرتا تھا اور وہ ہنس کر سینے سے لگا لیا کرتے تھے۔

سال پر سال گزرتے چلے گئے۔ گاما جی گوشہ نشین ہو گئے۔ امام بخش بھی ان کے ساتھ مصری شاہ (لاہور) میں خانہ نشین ہو گئے۔ حمیدہ کو دشمنوں نے جالندھر میں زہر دے دیا اور مستقبل کا رستم زماں یوں ختم ہو گیا۔ پاکستان بن گیا۔ میں یہاں آ گیا۔ اب میں حکیم بن چکا تھا۔ ایک صبح دیکھا کہ گاما جی آ رہے ہیں! میں ان کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور ادب سے ان کے سامنے جھک گیا۔ انھوں نے بڑے پیار سے میری پیٹھ کو تھپتھپایا۔ سر پر دست شفقت پھیرا۔ وہ بہ حیثیت مریض آئے تھے۔ میں نے ان کے لیے دواؤں کا انتظام کیا۔ وہ لاہور چلے گئے۔ سال سوا سال بعد معلوم ہوا کہ استاد زیادہ علیل ہیں۔ میں مصری شاہ گیا۔ محترمہ بیگم گاما نے بڑی محبت سے بٹھایا۔ میں گاما جی کے سرہانے بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا رہا۔ وہ گاما جس نے زبسکو کو فیتوں ہوا میں اچھال دیا تھا، بڑھاپے اور علالت کی وجہ سے وہ ایک مکھی کو نہ اڑا سکتے تھے۔ ایک دور تھا کہ گاما کی یومیہ خوراک دو سیر بادام، دس سیر دودھ اور پندرہ سیر گوشت کی یخنی تھی۔ وہ دو تین ہزار ڈنٹر روز پیلتے تھے۔ ہزاروں بیٹھکیاں لگاتے تھے۔ آج میں نے دیکھا کہ دودھ کی ایک پیالی ان کے سامنے رکھی تھی اور اسے پینے کو ان کا دل نہیں چاہتا تھا۔

آخر گاما جی کا آخری وقت آ گیا۔ دنیا کا سب سے طاقتور انسان موت سے شکست کھا گیا۔ ان کا جنازہ اٹھا تو لاہور شہر آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ ریڈیو پاکستان نے ان کے جنازے پر رننگ کمنٹری نشر کی۔ ادیب الملک نواب خواجہ محمد شفیع صاحب کمنٹیٹر تھے۔ خواجہ صاحب نے لوگوں کو رلا دیا۔ پھر میری درخواست پر خواجہ محمد شفیع صاحب نے ''گاما'' نام کی ایک کتاب لکھی جسے میں نے اپنے استاد رستم زماں گاما کے احترام میں شائع کیا۔ گاما زندہ باد!

بھلا نہیں سکتا

ہمارے یہ مسعود احمد برکاتی صاحب اچھے دلچسپ انسان ہیں۔ ہمیشہ ان کو شرارت ہی سوجھتی تھی۔ جب بھی ہمدرد نونہال کا خاص نمبر نکلتا، یہ آتے اور فرماتے: خاص نمبر کے لیے اپنی چند شرارتیں تحریر فرمادیں۔ میں ان کو دیکھتا، اوپر سے نیچے تک! اچھے خاصے شریف آدمی لگتے، مگر سوجھتی شرارت تھی! میرے ساتھی ہیں۔ ان کی بات ٹالتا تو کیسے! قلم اٹھایا اور چند شرارتیں لکھ دیں۔ وہ چھپیں۔ میرے نونہالانِ وطن نے ان کو پڑھا اور پھر لاتعداد خطوط آئے۔ شرارتوں سے بھرے ہوئے۔ میں ان کو پڑھتا اور میرا دل خوش ہوتا کہ میرے نونہال مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ ہاں، نونہال بھی کم شریر نہیں ہیں۔ فرمایئے۔ یہ شرارت نہیں تو کیا ہے کہ سیکڑوں نونہال مجھے عید کارڈ بھجواتے ہیں۔ بہت سے اپنے پتے نہیں لکھتے! اب انکل سعید ہیں کہ حیران اور پریشان! جواب دیں تو کیسے دیں؟ اچھا، بات تو جناب برکاتی صاحب کی شرارت سے چلی تھی۔ اس بار وہ تشریف لائے۔ نہایت سنجیدہ، متین بنے ہوئے، فرمانے لگے: ہمدرد نونہال کے خاص نمبر کے لیے کچھ تحریر فرمادیں۔ یہ کہہ کر ان کا دل مسکرایا، لاکھ چھپایا، مگر دل کی مسکراہٹ چہرے پر آہی گئی۔ دوسرے سانس میں فرمایا: اس بار اپنے برادرِ گرامی کو موضوع بنایئے۔

یعنی آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کی شرارتیں لکھوں؟ ''معاذ اللہ'' حلق سے عین کی آواز نکال کر برکاتی صاحب نے فرمایا ''میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی شرارتوں کا آپ کے برادرِ گرامی نے کیسے نوٹس لیا۔''

اچھا! بات تو وہی ہوئی نا کہ میں اپنی شرارتیں ہی لکھوں! مگر برکاتی صاحب! آپ نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے! کیا میں ساری زندگی شرارتیں ہی کرتا رہا ہوں؟ ارے بھائی، میں

نے اچھے کام بھی تو کیے ہیں؟

خیر جناب، بات ختم ہوئی اور برکاتی صاحب تشریف لے گئے۔ ان کو جیسے اطمینان ہو گیا ہو کہ میں ہمدرد نونہال کے لیے کچھ لکھ دوں گا۔ دل میں تو آیا کہ میں ایک اور شرارت کروں یعنی ٹال دوں اور کچھ نہ لکھوں! مگر ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔ دل توڑنا شیوۂ مسلم نہیں ہو سکتا۔

میرے نونہالو! میں نے جتنی شرارتیں کی تھیں شاید سب ہی تو لکھ چکا ہوں۔ میری شرارتوں نے بہت سے نونہالوں کو شریر بنا دیا ہے۔ اب میں شریر نونہالوں کی فوج تو تیار کرنے سے رہا۔ سوچا کہ اس بات کوئی کام کی بات بھی ہو جائے یعنی شرارت کے بجائے شرافت کا ذکر ہو جائے۔

لو بھئی سنو! ایک بار کیا ہوا کہ حضرت سلطان غازی رحمتہ اللہ علیہ کے عرس میں گئے۔ یہ مزار اقدس قطب صاحب مہرولی، دلّی سے کوئی ۱۷۔۱۸ میل دور جنگل بیابان میں ہے۔ ہر سال ۱۷ شوال المکرم کو عرس ہوتا تھا۔ لوگ پہلے قطب صاحب آتے۔ قطب مینار کو شوق اور فخر سے دیکھتے ہوئے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرجع خلائق مزار شریف آتے۔ فاتحہ خوانی کرتے۔ ادب سے الٹے پاؤں باہر آتے اور اپنی منزلوں کو ہزار امیدوں کے ساتھ سدھارتے۔

میں جب بھی مہرولی (صوبہ دہلی) جاتا، پہلے مزار خواجہ پر حاضری دیتا۔ آج بھی میں جب دہلی جاتا ہوں تو خواجہ صاحب کے ہاں حاضری ضرور دیتا ہوں۔ خیر، تو صاحب ہم ۱۷ شوال کو دہلی سے نکلے، مہرولی آئے۔ یہاں ہمارے دوست جناب اشتیاق حسین شوق منتظر ہوتے۔ بڑے اچھے شاعر تھے۔ سارے انتظامات وہ کرتے تھے۔ اپنا کلام سناتے تو تخلص ''شوق'' کرتے، مگر جب دوسروں کا کلام پیش کرتے تو ''انقلاب'' تخلص فرماتے تھے۔ سلطان غازی کے مزار کے قریب ہمارے لیے خیمے لگ جاتے۔ رات کو عرس کے بعد لوگ وہاں ہی شب گزارتے۔ ہم بھی خیموں میں رہتے۔ دوسرے دن شکار کو نکل جاتے۔ یہاں ہرن کا شکار ہوتا تھا۔

رات بھر فاتحہ خوانی میں گزری۔ صبح نور کے تڑکے ہمارا قافلہ شکاری کپڑوں میں ملبوس ہرن کے شکار کو نکل گیا۔ میں بھی شاندار شکاری لباس پہنے تھا۔ برجیس، کوٹ، ہیٹ، خود کو اب اس لباس میں دیکھتا ہوں تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ میرے ہاتھ میں بارہ بور

تھی۔ کارتوس ایس جی۔ میں نے کھیتوں کی طرف رخ کیا۔ بھائی جان محترم میرے ساتھ تھے اور رحمت خاں ہمراہ۔ رحمت خاں کی آنکھیں غضب کی تیز۔ میلوں جا کر ہرن کو تاڑ لیتیں۔ شکار دیکھتا وہ تھا، مارتا میں تھا۔

گنّے کے کھیت تھے۔ خیال تھا کہ کوئی ہرن یہاں ضرور ہوگا۔ میں ہر طرح تیار کہ ہرن قلانچیں مارے اور میں ہوا میں اسے مار گراؤں مگر ہرن نہیں ملا۔ میں نے ایک گنا توڑا اسے چوسنا شروع کر دیا۔ جب آدھے سے زیادہ گنا چوس چکا تو بھائی جان محترم نے فرمایا: ''کھیت والے سے اجازت لے کر گنا توڑا ہے نا؟''

میں سٹپٹا گیا۔ وہاں کھیت والا کہاں تھا۔ میں نے سچ بات کہہ دی کہ یہ تو خیال نہیں رہا، مگر صرف اتنی بات بھائی جان محترم کو قبول نہ تھی۔ ان کا ارشاد ہوا کہ ہم جب تک گنّے کا معاوضہ ادا نہ کر دیں یہاں سے آگے نہیں جا سکتے۔ کھیت والے کا انتظار کرنا ہوگا۔

میں نے اپنے بھائی جان محترم کے حکم سے ایک بار بھی سرتابی آج تک نہیں کی ہے۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔ رحمت خاں سے کہا کہ بھائی تم میلوں سے ہرن کو دیکھ لیتے ہو۔ آج ذرا کھیت والے کو دیکھو کہ کہاں ہے! مگر کھیت والا نہ ملا۔ شکار دھرا کا دھرا رہ گیا۔ کھیت والا کوئی ۱۲ بجے ہاتھ لگا۔ اس سے سب سے پہلے معافی مانگی کہ اس کے کھیت کا گنا اس کی اجازت کے بغیر توڑا گیا۔ پھر اسے زبردستی پیسے دیے۔ شکار ختم۔ ہم سب اپنے خیمے پر واپس آ گئے۔ اطمینان کئی تھے۔ ایک تو یہ کہ بھائی جان محترم کے ارشاد کی تعمیل ہوئی۔ دوسرے یہ کہ کھیت والے سے معافی مانگنے کا موقع مل گیا اور ایک اور اطمینان یہ کہ برادر محترم حافظ محمد یحییٰ ایک ہرن مار لائے تھے۔

نیا سلیپر

ایک شام میں نے ایک نیا سلیپر خریدا۔ بڑا چمک دار تھا۔ اس کی چمک دمک سے دل خوش ہو گیا۔ ذرا مہنگا ملا۔ کوئی سوا روپے کا تھا۔ اسے پہن کر میں ہمدرد منزل میں پہنچا۔ رات کے کوئی دس بجے تھے۔ بھائی جان دواخانہ بند کرانے کے لیے اٹھ رہے تھے۔ میں نے سیڑھیاں چڑھیں، مگر

اس شان سے کہ کھٹ پٹ کھٹ پٹ سے زینہ گونج اٹھا۔ بھائی جان محترم ۔۔۔ سب سے پہلے سلیپر کی تعریف کی، دوسرے سانس میں فرمایا: ''کیا یہ ضروری تھا کہ اس نئے سلیپر سے زینے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے؟ مناسب یہ ہے کہ آدمی چلے تو آواز نہ ہو۔''

میں واقعی بڑا شرمندہ ہوا۔ وہ دن ہے (۱۹۳۱ء) اور آج کا دن، میں جب چلتا ہوں تو میرے قدم رکھنے کی کوئی آواز نہیں سن سکتا۔ بھائی جان محترم کی رہنمائی شریعت اسلامی کی روشنی میں تھی۔ قرآن حکیم میں واضح ہدایت ہے کہ زمین پر پیر پٹخ کر نہ چلو۔

دستر خوان پر ہنسی

یہ یقیناً ۱۹۳۴ء کی بات ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ سخت گرمیوں کے رمضان۔ ایسے سخت کہ برف کی صورت دیکھ کر دل ٹھنڈا ہو جاتا۔ مسجد میں اذان ہوئی اور میں وہاں سے سرپٹ بھاگا: ''روزے والو روزہ کھول لو۔ روزے دار روزہ کھول لو۔'' یہ ہم بچوں کا معمول تھا کہ مسجد میں جا کر کھڑے ہو جاتے۔ جیسے ہی اذان ہوتی، ہم محلے بھر کا روزہ کھلوا دیتے۔ گھر آیا۔ دستر خوان پر بھائی جان محترم، والدہ معظمہ، بہنیں وغیرہ سب ہی تھے۔ اس دور میں خاندان بھر اکٹھا ہو جاتا تھا۔ خلوص اور انس کی فضا تھی۔ ایک انسان دوسرے انسان سے محبت کرتا تھا۔

نہ جانے بھائی عبدالوحید (مرحوم) نے کیا حرکت کی کہ میں کھل کھلا کر ہنس دیا۔ ابھی میری ہنسی ختم نہ ہوئی تھی کہ رخسار پر ایک زنائے کا تھپڑ پڑا۔ یہ بھائی جان محترم کا ہاتھ تھا جس نے چودہ طبق روشن کر دیے! ہدایت یہ ملی کہ دستر خوان کے آداب یہ ہیں کہ انسان اس پر بیٹھ کر ٹھٹھے نہ مارے۔

میں پوری زندگی صرف دو بار بھائی جان محترم سے پٹا ہوں۔ ایک ۱۹۳۴ء میں اور اس سے پہلے ۱۹۲۷ء میں کراچی میں، جب ہم حج کے لیے براستہ کراچی جدہ جا رہے تھے۔ اس کراچی کے زنائے کا حال پھر کبھی سناؤں گا۔ اس کے علاوہ زندگی بھر اور آج بھی، بھائی جان محترم نے ہر ہدایت مجھے خود عمل کر کے دی ہے۔ انھوں نے میری تربیت کی خاطر اپنے سارے آرام تج دیے۔ وہ ساری زندگی بلکہ آج تک خود عمل کر کے نصیحتیں کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے مجھے حکیم محمد سعید بنا دیا۔

یادیں باقی ہیں

نقش قدم

برصغیر کے شعرا میں شاگرد داغ نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی کا بڑا مقام تھا۔ میں اپنے بچپن میں اس عظیم وجلیل شخصیت سے بڑا قریب رہا ہوں۔ ان کی صحت قابل رشک تھی۔ جسم بھاری مگر گٹھا ہوا۔ چہرہ مہر شیر کا سا۔ خوبصورت داڑھی، آنکھیں روشن، کھڑے ہو جائیں تو گاما بھی ایک بار شرما جائے۔ کئی مشاعروں میں نیز نجی صحبتوں میں کہ جو ہمدردی منزل (دہلی) میں برپا ہوتیں، حضرت سائل دہلوی کو سنا۔ ان کا ایک مصرع آج بھی کانوں میں گونجتا ہے۔ جب وہ حضرت شیخ کا نقشا کھینچتے تو ایک مصرع یہ آتا کہ:

جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی اور یوں بھی

مطلب یہ تھا کہ جناب شیخ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ میں سوچا کرتا تھا کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان زبان سے ایک بات کہے اور عمل اس کا دوسرا ہو۔ منبر پر کھڑا ہو کر صراط مستقیم کی دعوت دے اور خود ٹیڑھا راستہ اختیار کرے۔

مجھے اپنا بچپن خوب یاد ہے۔ گھر سے ہم تینوں بھائی نکلتے۔ بڑے بھائی جناب حکیم عبدالحمید آگے آگے ہوتے۔ میں اور منجھلے بھائی عبدالوحید صاحب پیچھے۔ میں کوشش کرتا کہ پیچھے دائیں جانب رہوں۔ میں کوچہ کاشغری، بازار سیتارام سے لال کنویں ہمدرد دواخانے تک اپنا قدم ٹھیک اسی جگہ رکھتا کہ جہاں بڑے بھائی کا قدم پڑتا۔ اکثر اوقات یہ کام خاصا مشکل ہو جاتا۔ میں چھوٹا، میرے قدم چھوٹے۔ بھائی جان محترم بڑے اور وہ ڈگ بھرتے۔ کبھی تو مجھے کودنا پڑتا تھا، مگر کوشش یہی ہوتی تھی کہ جناب شیخ کی طرح ''نقش قدم

یوں بھی اور یوں بھی۔'' نہ ہو۔ ٹھیک جگہ قدم پڑے۔

برسوں کی یہ مشق آج بھی جاری ہے! میں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ جو بھائی جان محترم کے مشورے کے خلاف ہو۔ ان کے نقش قدم پر چل کر میں حکیم حاجی حافظ محمد سعید بن گیا ہوں۔

آج جب میں اپنے نقش قدم کا جائزہ لیتا ہوں اور اس پر غور کرتا ہوں کہ خود جناب بھائی جان محترم نے میری تربیت کے لیے کیا کیا قربانیاں دی ہیں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ میری تربیت کی خاطر انھوں نے نہ جانے کن کن نعمتوں سے خود کو محروم رکھا ہے۔ برصغیر پاک وہند میں جناب حکیم عبدالحمید کی عظمت ورفعت کا سکہ جما ہوا ہے اور میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں، وہ بھائی جان محترم کے نقش قدم پر چلنے کا ثمرہ ہے۔ بزرگوں کا احترام کر کے میں حکیم سعید بنا ہوں۔

شیر مارکہ ترکی ٹوپی پھندنے والی

بہت بچپن کی بات ہے۔ چاندنی چوک پر ڈم ڈم بوٹ ہاؤس سے میں نے اصرار کر کے ایک بڑا چمک دار کالا سلیپر خریدا۔ یہ دکان دہلی میونسپلٹی کے نکڑ پر تھی۔ یہ دکان شاید میری پسندیدہ اس لیے تھی کہ اس کے مالکان بچوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اس دکان کے بالکل سامنے انصاری کیپ ہاؤس تھا جہاں سے ہم شیر گولا اور جب پیسے زیادہ ہوتے تو ڈبل شیر گولا مارکہ ترکی ٹوپی پھندنے والی خریدا کرتے۔ میں بچپن میں نرم ٹرکش کیپ پہنا کرتا تھا اور سر پر ٹوپی رکھ کر پھندنے کو ایک خاص انداز سے ہلانا مجھے بڑا پسند تھا۔

اب سنیے حال میری شیر مارکہ پھندنے والی ترکی ٹوپی کا جو مجھے بہت پسند تھی اور جس پر میں اپنے تعلیم قرآن کے ساتھیوں کے سامنے فخر کرتا تھا۔ چچا جان (میری ناظرہ تعلیم قرآن کی استانی کے شوہر) نے ہم بچوں کو ساتھ لے کر سلطان جی جانے کا پروگرام بنالیا یعنی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا جمعرات کا دن تھا۔ حوض قاضی دہلی (جہاں ہمارا گھر تھا) سے ایک یکہ کرایے پر لیا۔ چھ پیسے کرایہ طے ہوا۔ چچا جان اور سب بچے اس میں سوار

ہو گئے۔ حوض قاضی سے سلطان جی کا فاصلہ ۸۔۹ میل ہوگا۔

خیر ہم سب بچوں نے مزار حضرت پر فاتحہ خوانی کی۔ پھر سیر کے لیے باؤلی آ گئے۔ اس باؤلی پر تیراک اوپر سے کودتے اور تیرتے۔ بڑا دلچسپ منظر ہوتا۔ اوپر جھروکوں میں ہم بچے بیٹھ جاتے اور چچا جان نگرانی کرتے رہتے۔

میں اپنی شیر مار کہ ترکی پھندنے دار ٹوپی اوڑھے ہوئے تھا۔ ایک لمبا تڑنگا تیراک بڑی اوپر سے باؤلی میں کودا۔ میں نے اسے بڑی داد دی۔ سر کو زور سے ہلایا۔ پھندنے کو چکر دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سر پر سے ٹوپی نے زقند لگائی اور ٹوپی اسی تیراک کے ساتھ باؤلی میں جا گری۔ اوسان خطا ہو گئے۔ ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ چچا جان محترم اٹھے۔ مدد مانگی۔ اتنے میں کہ تیراک ٹوپی تک پہنچے۔ ٹوپی پانی میں ڈوب چکی تھی۔ چچا جان خاموش ہو گئے۔ بچے خوش ہو گئے۔ رات کو جب ماموں فضل کی انگلی پکڑ کر گھر آیا تو محترمہ آپا صاحبہ (والدہ مکرمہ) نے ننگے سر دیکھا:

''ٹوپی کہاں ہے؟''

''وہ تو نظام الدین باؤلی میں گر گئی۔ ڈوب گئی۔''

''اور سر ہلاؤ اور ناچو، اور فخر کرو، بڑے بول کا سر نیچا۔''

اور میں سر نیچا کر کے خاموش بیٹھ گیا۔

سعید پارے

ابھی صبح کے تین بجے تھے اور آخر رات تھی کہ میں بیدار ہو گیا۔ کسمسایا۔ شیطان نے بہکایا۔ کہنے لگا: ''سعید، سعید، ابھی تو رات ہے۔ سو جاؤ۔ سو جاؤ۔ میں صبح دن چڑھے تم کو جگا دوں گا! سو جاؤ۔''

نونہالو! پہلے تو میں شیطان کی لوریاں مزے سے سنتا رہا۔ جب اس نے کہا: ''سعید سو جاؤ تو مجھے اس کی یہ بات بڑی اچھی لگی۔ میں نے رضائی لپیٹی اور آنکھیں بند کر لیں، مگر اتنے میں میرا ضمیر بیدار ہو گیا۔ دل روشن ہو گیا۔ میں نے فوراً شیطان کی بات کو دل سے نکال کر پھینک دیا۔ زور سے لاحول ولاقوۃ پڑھی۔ لاحول پڑھتے ہی شیطان ایسا بھاگا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ کلمہ طیبہ پڑھا: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ! چھلانگ لگائی اور بستر سے باہر!

نونہالو! مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا ہے تم ذرا غور سے سن لو۔

ایک بار ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ اپنی پیاری سی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ملنے گئے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو ملول پایا، حال دریافت فرمایا۔ چکی پیستے پیستے بنت رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے خواہش ظاہر کی کہ جنگی قیدیوں میں آئے ہوئے ایک قیدی کو میرے گھر کے کام کے لیے دے دیں تو اچھا ہوگا۔

پیارے نبی کریم ﷺ نے اپنی اکلوتی پیاری بیٹی کا درد سنا، مگر فرمایا: اپنی ذات کے

لیے قیدی کی خدمات نہیں دی جاسکتیں۔ پھر فرمایا: تم تسبیح پڑھا کرو۔ اللہ تعالیٰ تمھاری غربت اور اذیت دور فرمائے گا۔ ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمدللہ، ۳۴ بار اللہ اکبر۔

نونہالو! سارے مسلمان یہی تسبیح پڑھتے ہیں۔ میں بھی پڑھتا ہوں۔ میں یا حی یا قیوم پڑھتا ہوں۔ کہا گیا ہے کہ یہ اسم اعظم ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑے ہیں۔ وہ حی بھی ہیں، قیوم بھی۔

(حی معنی زندہ رہنے والا۔ قیوم معنی قائم رہنے والا)

یا سلام بھی خوب تسبیح ہے اور سلامتیاں لاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے عزیز نونہالوں پر سلامتیاں نازل فرمائے۔

دنیا کا ایک حیرت انگیز عالم

نونہالو! آؤ میں تم کو دنیا کے بڑے عالم کی بڑی دلچسپ داستان سناتا ہوں۔ یہ فقط کہانی نہیں ہے، سچی داستان ہے۔ میرے استادِ محترم جناب قاضی سجاد حسین صاحب نے یہ واقعہ مجھے سنایا تھا۔ قاضی صاحب نے مجھے عربی پڑھائی۔ وہ دیوبند سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت محمد طیب کے قریب تر تھے۔ مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں صدر مدرس تھے۔ وہ استاد بھی تھے، دوست بھی تھے۔ افسوس کہ اچانک ان کا انتقال ہوگیا

ہاں تو بخارا (وسط ایشیا) میں ایک عالم تھے۔ نام تھا ان کا حضرت مولانا ابوبکر محمد بن ابی سہل سرخسی۔ وہ گیارہویں صدی کے عالم تھے۔ بخارا کے ایک امیر نے ان کو سچ بات کہنے پر سزا دی اور ان کو ایک کنوئیں میں ڈال دیا۔ وہاں ان کو کھانا پینا ملتا رہا۔ مہینوں وہ اس عذاب میں مبتلا رہے نگران کو اجازت تھی کہ وہ کنویں میں بیٹھے بیٹھے اپنے شاگردوں کو سبق لکھوا سکتے تھے۔

نونہالو! ذرا دیکھو کہ پھر کیا ہوا۔ شاگرد آتے۔ کنویں کی منڈیر پر آکر بیٹھ جاتے۔ کنویں کے اندر سے استادِ محترم بولتے جاتے۔ شاگرد لکھتے جاتے۔ انھوں نے لکھا اور مہینوں لکھا۔ کتاب تیار ہوگئی۔ فقہ پر ۲۷ جلدیں تیار ہوگئیں۔ ہزاروں صفحے۔ نونہالو! یہ کتاب میرے پاس ہے۔ میں قاہرہ (مصر) سے لایا ہوں۔

تم نے غور کیا! علامہ سرخسی کس قدر زبردست عالم تھے! مہینوں سے کنویں میں بند ہیں مگر دماغ کا یہ عالم ہے کہ کنویں کے اندر بیٹھے بیٹھے ۲۷ جلدیں املا کرادیں۔ فقہ پر یہ بہترین کتاب تسلیم کی گئی ہے۔

نونہالو! اتنے بڑے عالم یورپ میں بھی پیدا نہیں ہوئے۔ مسلمانوں کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ اس لیے بلند تھا کہ علم کو مسلمانوں نے معراج پر پہنچا دیا تھا۔

شادیاں

نونہالو! کراچی کی شادیاں اب بڑی مشکل ہو چکی ہیں۔ ایک نہایت آسان سنت کو ہم نے ایک نہایت گراں روایت بنا دیا ہے۔ ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ نے جب اپنی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا کا نکاح کیا تو سادگی کی انتہا تھی۔ ذرا تم غور کرو۔

حضرت فاطمۃ الزہرا جب بڑی ہوئیں تو بہت سے لوگوں نے حضورؐ کے سامنے ان سے شادی کی خواہش ظاہر کی، مگر آپ نے کوئی رشتہ قبول نہیں کیا۔ جب حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ سے شادی کی درخواست کی تو آپؐ نے قبول فرمالی۔ دوسرے روز آپؐ نے حضرت علیؓ کو بلایا اور پوچھا کہ ان کے پاس مہر کے لیے رقم ہے؟ حضرت علی نے جواب دیا: "نہیں ہے۔" اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جنگ بدر میں جو زرہ ہاتھ آئی تھی، وہ کیا ہوئی؟ حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ وہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اسے فروخت کردو۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کے مہر کے لیے چار سو مثقال چاندی مقرر فرمائی۔

حضرت فاطمہؓ کے جہیز میں ایک چارپائی، چمڑے کا توشک، ایک کملی، ایک مشک اور چمڑے کا ایک تکیہ تھا۔

اس سادگی پر غور کرنا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کا عمل ہے۔ اب ہمارا عمل یہ ہے کہ شادی سے پہلے کم از کم چھے دنوں تک طرح طرح کی تقریبات ہوتی ہیں۔ سیکڑوں لوگ مدعو ہوتے ہیں۔ پھر نکاح ہوتا ہے تو ہزاروں مہمان آتے ہیں۔ اس کے بعد ولیمے میں ہزاروں مہمان ہوتے ہیں۔ جب دعوت نامہ آتا ہے اور اس میں "ولیمہ مسنونہ"

لکھا ہوتا ہے تو مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ نونہالو! مسنونہ کے یہ معنی ہیں کہ وہ عمل کہ جو نبی اکرم ﷺ کا تھا۔ ان کی سنت تھی۔ ہم کس قدر غلط انسان ہو گئے ہیں کہ "ولیمہ مسنونہ" دعوت ناموں میں لکھتے ہیں اور ولیمے میں ہر کام خلاف سنت کرتے ہیں۔ ولیمے میں ہزاروں انسانوں کو دعوت دینا سنت کے قطعی خلاف ہے۔ روپیہ ضائع ہو رہا ہے۔ وقت ضائع ہو رہا ہے۔

میرے نونہالو! ان دنوں شادیوں میں یہ ہو رہا ہے کہ وقت آٹھ بجے کا دیا جاتا ہے۔ مہمان ساڑھے نو بجے آنا شروع کرتے ہیں۔ ایک گھنٹے میں جمع ہوتے ہیں۔ پھر اگر بارات وقت پر نہ آئے تو اس کا انتظار ہوتا ہے۔ بارات اکثر و بیشتر ساڑھے دس بجے آتی ہے۔ نکاح ہوتا ہے۔ گیارہ بج جاتے ہیں۔ پھر کھانا کھلتا ہے۔ رات کے بارہ تو بج ہی جاتے ہیں۔ اگر ایک ہزار مہمان ہیں تو چار ہزار گھنٹے ضائع ہوئے۔ شہر کراچی میں شادی گھروں کی کوئی حد نہیں ہے۔ جدھر جایئے ایک سے ایک بڑا شادی گھر موجود ہے اور سب مہینوں کے لیے بک ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹل اب شادیوں کی وجہ سے چھوٹے پڑ گئے ہیں۔ میں نے ابھی پوری طرح جائزہ نہیں لیا مگر میرا اندازہ یہ ہے کہ شہر کراچی میں کوئی تین چار لاکھ افراد اپنی شامیں شادیوں میں گزارتے ہیں اور سولہ لاکھ گھنٹے روزانہ ضائع ہو رہے ہیں۔ یہ تو وقت کی بات ہوئی۔ اب دولت کا حساب لگایئے تو خلاصہ یہ ہے کہ ایک مہمان پر کم سے کم پچھتر روپے روز خرچ ہوتے ہیں (یہ چھوٹے شادی خانو کا اوسط ہے)۔ بڑی جگہوں کا حساب ایک سو روپے فی کس اگر ہے تو پھر چار لاکھ مہمانوں کا حساب یہ ہوا کہ شادیوں پر کراچی میں روزانہ چار کروڑ روپے صرف ہوتے ہیں۔ یہ جہیز وغیرہ پر خرچ ہونے والی رقم کے علاوہ ہیں۔ اسے جوڑو تو اربوں روپے بنتے ہیں۔

نونہالو! یہ ہیں ہمارے اللّے تللّے۔ آج حال یہ ہے کہ پاکستان نے اس قدر قرضے لیے ہیں کہ پاکستان کا ہر شخص مقروض ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں ہماری بچیاں شادیوں سے محروم ہیں، اس لیے کہ ان کے والدین کے پاس پیسے نہیں ہے۔

کراچی شہر میں جہاں شادیوں پر یہ اخراجات ہو رہے ہیں وہاں کوئی پانچ لاکھ انسان

سڑکوں، باغیچوں، دکانوں کے تھڑوں پر سوتے ہیں۔ ان کو چھت میسر نہیں ہے۔ ہزاروں لاکھوں انسان کراچی میں دو وقت آرام سے کھانا نہیں کھا سکتے۔ اس حال میں شادیاں انتہائی سفاکیاں ہیں۔ ان کو بند ہونا چاہیے۔

ان شادیوں کے جہیز

معاذ اللہ! ان شادیوں کے جہیز کی کوئی حد بھی ہے۔ لاکھوں روپے جہیز پر خرچ ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے۔ آج ہی میری نواسی آمنہ بتا رہی تھیں کہ ان کی ایک جاننے والی کا شادی کا جوڑا اسّی ہزار روپے میں بنا ہے۔ یہ ایک عام شادی کا جوڑا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک گھر میں دیکھا ہے کہ جہیز میں ایک بھینس دی گئی تھی اور اس بھینس کا زیور لاکھوں کا تھا۔ شاہ راہ فیصل پر ایک شادی کپڑوں کا مرکز ہے۔ یہاں دلھن کا ایک چادر اکئی لاکھ کا بنا۔ اس پہ ہیرے لگوائے گئے۔ یہ میرا ذاتی مطالعہ ہے۔

نونہالو! یہ سب زوال کی علامتیں ہیں۔ یہ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ ان کے خلاف سوچنا چاہیے۔

اب جے پور کا واقعہ سن لو

نونہالو! جب میں کوئی ۵۔۶ سال کا تھا، ہماری والدہ محترمہ ہمیں اجمیر شریف سے جے پور لے گئیں۔ ساتھ میں بڑے بھائی جناب حکیم عبدالحمید اور درمیانے بھائی حافظ عبدالوحید بھی تھے۔ خالہ فاطمہ صاحبہ بھی تھیں۔ ہم وہاں ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے۔ مجھے اب تک جے پور میں حیوان خانہ (زو) دیکھنا یاد ہے۔ سب سے زیادہ مجھے وہاں شیر پسند آئے تھے وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔ خیر جی، ابھی دن ڈھلا ہی تھا کہ بڑے کالے بادل آسمان پر آ گئے۔ گرج چمک نے ہمیں ڈرا دیا، سہما دیا۔ سخت بارش ہوئی۔ موسلا دھار۔

گھنٹہ بھر بعد خاصی ٹھنڈک ہوئی۔ اتنے میں کیا دیکھا کہ ایک آدمی ملائی کی برف فروخت کرتا آیا۔ ہم نے اسے آواز دی۔ بڑی محبت کی زبان بولی۔ بیٹھ گیا۔ ملائی برف

صندوقچے میں تھی۔ اس زمانے میں برف جما کر اسے اون میں لپیٹ کر ایک صندوقچے میں رکھنے کا رواج تھا۔ سردی میں برف کون کھاتا ہے۔ برف والا بھی جانتا تھا کہ اگر برف نہ بکی تو ضائع ہو گی۔ وہ بیچنے کے لیے بے چین تھا اور ہم بچے کھانے کے لیے تیار۔ اس نے برف کے پورے قلفے کے پانچ روپے مانگے، ہم نے اسے آٹھ آنے میں لینے کی بات کی۔ اگر موسم اچھا ہوتا تو دس روپے کا مال تھا جو صبح سے رات تک بک جاتا۔ نونہالو! اس زمانے میں آٹھ آنے بھی بڑی رقم ہوتی تھی۔ اس نے آٹھ آنے میں ہمیں سارا قلفہ دے دیا۔ ہم سب نے خوب کھایا۔ برف والا ناخوش تھا، مگر مجبور تھا۔ ہم نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔

خیر جناب برف خوب کھائی۔ برف والا آٹھ آنے لے کر چلا گیا۔ اب شام کے بعد رات ہوئی۔ بارش تھی کہ جاری تھی۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ ہم تینوں بھائیوں کو رات کو بخار چڑھ آیا۔ صبح اٹھے تو ہم بخار میں بھن رہے تھے۔ ہماری والدہ محترمہ خاصی پریشان ہوئیں۔ پردیس کا معاملہ۔ ہم کسی کے مہمان تھے۔ خیر علاج تو ہوا، مگر ہماری والدہ محترمہ نے جو بات کی وہ مجھے آج تک یاد ہے۔ انھوں نے فرمایا:

"تم نے کل شام برف والے کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اسے برف کی قیمت کم دی تھی۔ اس نے بددعا کی، اس لیے یہ بخار آیا ہے۔ کسی کا حق مارنے کی یہ سزا ہے جو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔"

جاپان کا مرکز ثقافت

کراچی میں جاپان کا ایک ثقافتی مرکز (کلچرل سینٹر) ہے۔ یہاں روزانہ کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی ہی رہتی ہے۔ آج یہاں کراچی کے کئی اسکولوں کے نونہالوں کی تیار کی ہوئی چیزوں کی نمائش ہے۔ کسی نے اسکول کے بجلی کے آلات بنائے ہیں اور کسی اسکول کے نونہالوں نے زندگی کے کئی پہلوؤں پر ڈیزائن بنائے ہیں۔ کشیدہ کاریاں بھی دیکھنے میں آئیں۔ صحت مند ماحول کے نقشے بھی یہاں دیکھے۔ ہمدرد پبلک اسکول کے نونہالوں نے بھی حصہ لیا۔ اس نمائش کو رات کی بارش نے ذرا خراب کر دیا ہے مگر جناب اتا کا صاحب

نے حالات کو سنبھال لیا ہے۔ جناب اتا کا صاحب جاپانی ہیں اور نہایت اچھی اردو بولتے ہیں۔ انھوں نے پاکستانی خاتون سے شادی کی ہے۔ کوئی مہینہ سوا مہینہ ہوا کہ ان کے ہاں ایک پیاری سی بچی پیدا ہوئی ہے۔ میری بیٹی سعدیہ نے بیگم اتا کا سے پوچھا: "بچی کا نام کیا رکھا ہے؟" انھوں نے کہا: خمیرۂ ہمدرد! وہ "خمیرۂ ہمدرد اور عرق گلاب کھاتی پیتی رہی ہیں۔"

خیر نمائش کا افتتاح ہم تینوں نے کیا یعنی جاپان کے قونصل جنرل جناب یوشی نوری ایما گاوا صاحب! یہ بھی اردو خوب بولتے ہیں، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب اور میں نے افتتاح کیا۔ پھر میں ہر اسٹال پر گیا۔ ہر نونہال چاہتا تھا کہ میں اس کی محنت کی داد دوں۔ وقت کم تھا، مگر میں نے ہر اسٹال پر حاضری دی اور داد دی۔

جناب محترم ڈاکٹر حمید اللہ

نونہالو! ہمارے اس دور کے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بہت بڑے انسان ہیں۔ گذشتہ ساٹھ سال سے اسلام کی سربلندی کے لیے کوشاں ہیں۔ اب تو عرصہ دراز سے پیرس میں ہیں۔ جرمنی میں رہ چکے ہیں۔ جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے ماہر ہیں۔ قرآن حکیم کا فرانسیسی ترجمہ ان کا ایک کارنامہ عظیم ہے۔ سیرت رسول اللہ ﷺ پر فرانسیسی زبان میں کتابیں ہیں جن کا ۲۰واں اڈیشن چھپ رہا ہے۔ فرانس میں اسلامی تحریک کے اس حیثیت سے سربراہ ہیں کہ انھوں نے نعروں سے نہیں اپنے فکر و عمل اور اپنی تحریروں سے اسلامی انقلاب برپا کیا ہے۔ ہزارہا فرانسیسی ان کے ہاتھوں اسلام قبول کر چکے ہیں اور قبول کرتے جا رہے ہیں۔ میں چند ماہ ہوئے پیرس گیا تھا۔ جناب ڈاکٹر محترم صاحب سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ ان سے ملنا اور ہاتھ ملانا باعث فخر ہے اور سبب عزت ہے۔ میں نے ان کا چوتھی منزل پر گھر دیکھا ہے۔ شاید ۴۰ سال سے یہاں تنہا رہتے ہیں۔ نہ بیوی نہ اولاد۔ ایک کمرا ہے اور وہ بھی لگتا ہے کہ کتابوں کا اسٹور ہے۔ کھرّے پلنگ پر ڈاکٹر صاحب بیٹھ کر کام کرتے ہیں اور اتنے بڑے کام کر ڈالے کہ دنیا ورطۂ حیرت میں ہے۔

مجھے یہ فخر ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب کے مرتبے پر ایک کتاب چھاپ رہا ہوں۔

نونہالو! تم سے میری یہی شرطِ دوستی ہے کہ تم بس وقت کی قدر کرنا۔ ایک لمحہ ضائع نہ کرنا۔ میں تم کو پاکستان کا بڑا بنانا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے اپنے وقت کا اچھا استعمال کر لیا تو تمھارے بڑے ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ تم نے دیکھا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس جیسے خوبصورت اور عظیم شہر میں ایک نہایت چھوٹے سے کمرے میں رہ کر بھی دنیا کے ایک بڑے انسان بن گئے ہیں۔

نونہالو! تم اپنے میں یہ جذبہ پیدا کرو۔ ذرا ان کی سادگی دیکھو۔ میرے نونہالو! وزیر اعظم پاکستان نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کو لینے کے لیے فرانس کے سفیر کی موٹر کار بھیجی، مگر وہ زمین دوز ریل سے گئے۔ کہا: ''میں موٹر استعمال نہیں کرتا۔ میری سواری زمین دوز ریل گاڑی ہے۔''

کام کی باتیں

کل کے نونہال اور آج کے بڑے جب ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بچپن میں ہمدرد نونہال پڑھا تھا اور ہم آج بڑے ہو گئے ہیں بڑے عہدوں پر فائز ہوئے ہیں۔ نونہالو! یہ سن کر میرا تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ میں ان بڑوں کو اپنے سینے سے لگا لیتا ہوں۔

ابھی کل ہی کی بات ہے کہ میں نوجوانوں کے ایک پروگرام میں گیا تھا۔ وہاں بلند میز (ہائی ٹیبل) پر ایک خاتون بھی تھیں۔ میں ان کو پہچان نہ سکا۔ اب جو وہ تقریر کرنے کھڑی ہوئیں تو فرمایا بچپن میں ہمدرد کی شائع کردہ کہانیاں پڑھی تھیں۔ چنو منو کی جادو کی بوتل۔ پھر رسالہ نونہال پڑھنے کو ملتا رہا۔ اب یہ محترمہ جہاں آرا پروفیسر ہیں۔ میرے نہایت پیارے دوست ڈاکٹر محمد رفیق الدین مرحوم کی بیٹی ہیں۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا:

''جہاں آرا کے پیدا ہونے پر ان کے کانوں میں اذان میں نے دی تھی۔''

جہاں آرا اب محترم پروفیسر ہیں، استاد ہیں۔ نونہال پڑھ کر بڑی ہوئی ہیں، استاد ہوئی ہیں۔

ہاں نونہالو! ایک واقعہ اور یاد آ گیا۔ ایک دن ہوا یہ کہ مطب میں زہرہ بیگم آئیں۔ بوڑھی سی، سارے بال سفید، عینک لگی ہوئی۔ میں نے زہرہ بیگم کو اولیت دی۔ دوسروں سے پہلے بلا لیا۔ بعض خواتین کے دل میں سوال پیدا ہوا کہ آخر ان میں کیا خاص بات ہے کہ حکیم صاحب نے ان کو پہلے دیکھ لیا۔ ہم جو صبح کے یہاں بیٹھے ہیں۔

نونہالو! میں نے دل کی بات پڑھ لی اور کہا: ''زہرہ بیگم جب سال بھر کی تھیں تو میں نے ان کو اپنی گودوں میں کھلایا ہے۔ بہت روتی تھیں۔ میں ان کو بہلانے کے لیے پانی کے جہاز ایس ایس علوی کے عرشے پر لے جایا کرتا تھا۔ یہ ۱۹۲۷ء کی بات ہے۔ زہرہ بیگم کی

والدہ میری والدہ کی دوست تھیں۔ جب حج کو چلے تو زہرہ بیگم کی والدہ ہمارے ساتھ تھیں اور زہرہ میری گود میں۔''

نونہالو! ساری خواتین حیران ہوئیں، خوب ہنسیں، مسکرائیں۔ زہرہ بھی ہمدرد کی کہانیاں پڑھ کر بڑی ہوئی ہیں۔

نونہالو! سچ پوچھو تو تمھارا ہمدرد نونہال ہے ہی اچھا رسالہ۔ اسے ہر ایک نے پسند کیا ہے۔ آج سندھ میں بہت سے ہیڈ ماسٹر ہیں جنھوں نے بچپن میں ہمدرد نونہال پڑھا تھا۔ میں گورنر سندھ تھا تو اندرون سندھ اسکولوں میں جاتا تو یہ سب معلوم ہوتا تھا۔

آج میرے عظیم نونہال جو ہمدرد نونہال پڑھ رہے ہیں وہ ضرور کل بڑے انسان بنیں گے۔ پروفیسر، حکیم، ڈاکٹر، صحافی، انجینئر، افسر وغیرہ۔ رسالہ نونہال مجھے اتنا پسند ہے، اتنا پسند ہے کہ میں اس کا انتظار کرتا ہوں۔ ہر مہینے کا رسالہ اول سے آخر تک جب تک نہیں پڑھ لیتا مزہ نہیں آتا۔ جناب مسعود احمد برکاتی صاحب یہ رسالے محفوظ کر رہے ہیں۔ ہر رسالے پر میرا نوٹ ہوتا ہے۔ مشورہ درج ہوتا ہے۔ داد بھی لکھی ہوتی ہے اور ہاں، اب تو میرا حال یہ ہے کہ میں بڑوں کے لیے کم ہی لکھتا ہوں، صرف اپنے عظیم نونہالوں کے لیے قلم اٹھاتا ہوں۔ کل ہی کی بات ہے کہ جناب رفیع الزماں زبیری صاحب نے مجھے بتایا کہ نونہالوں کے لیے میری کتابیں ایک سو ہونے والی ہیں۔ اب زبیری صاحب ایک تقریب کی فکر میں ہیں۔ ایک سنچری ہوگئی ہے نا! اور میں اب تک آؤٹ نہیں ہوا۔ ارادہ ریکارڈ قائم کرنے کا ہے۔ پانچ سو رن تو بنا ہی لوں گا! مگر چوکے چھکے کم مارتا ہوں۔ نہایت غور کر کے، نہایت سوچ سمجھ کر ایک ایک حرف تول کر لکھتا ہوں۔ نونہال میری کتابیں پڑھتے بھی شوق سے ہیں۔

اصل اور حق بات یہ ہے کہ وطن کے نونہال میرے دوست ہیں۔ میں نے نونہالوں سے پکی دوستی کر لی ہے۔ اب جب دوستی ہوگئی تو پھر دوستی کا حق بھی ادا کرنا چاہیے۔ خالی خولی نام کی دوستی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بس میں نونہالوں کے لیے کتابیں لکھتا ہوں اور جب تک صحت اور زندگی ہے دوستی کا حق ادا کرتا رہوں گا۔

میرے عظیم نونہال بھی دوستی کا حق ادا کرتے رہیں۔ وہ میرے لیے خیر کی دعا

ضرور کریں۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر دعا کریں کہ میں صحت مند رہوں۔ صحت تو بے حد ضروری ہے۔ صحت کی دعا کرنا اور صحت مند اور تندرست رہنا ہر نونہال کا حق اور فرض ہے۔

میرے عظیم نونہالو! اللہ تعالیٰ تم سب کو تعلیم سے آراستہ فرمائیں اور تم خوب پڑھ لکھ کر بڑے انسان بنو۔ تمھارے دل محبتوں سے کبھی خالی نہ ہوں۔ تم شاد آباد ہو اور منزل مراد پاؤ۔

دہلی کی ڈائری

۲۳ر جولائی ۱۹۹۰ء پیر۔ دہلی

دہلی مجھے بہت پسند ہے۔ برصغیر کے نامور ادیب وصوفی مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی اپنے رسالے "منادی" میں دہلی کو "دل لی" تحریر فرمایا کرتے تھے۔ دہلی کو دل لی کہنا مجھے بھی بھاتا ہے۔ میں نے ۱۹۴۸ء کی ۹ جنوری کو دہلی کو خیر باد کہہ دیا تھا اور کراچی میں آباد ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ دہلی چھوڑے ہوئے مجھے اب اور آج بیالیس سال ٦ ماہ ۱۴ دن ہوگئے ہیں، مگر میرا دل دل لی میں خوش ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں میرے بڑے بھائی جان محترم حکیم عبدالحمید صاحب رہتے ہیں۔ وہ میری زندگی ہیں۔ انھوں نے، ان کی اعلا تربیت نے اور ان کی بے کراں محبت نے مجھے حکیم محمد سعید بنایا ہے۔ میں ان کی محبت، ان کی اعلا تربیت اور ان کی ہدایت کی وجہ سے ایسا انسان بنا ہوں جس سے نونہالانِ وطن محبت کرتے ہیں، جس کا جوانانِ پاکستان احترام کرتے ہیں اور جس کو صاحبانِ علم وحکمت خدمت گزار تسلیم کرتے ہیں متعدد میدانوں میں میری کامیاب خدمات بھائی جان محترم کی وجہ سے ہیں۔

دو مثالی بھائی

ہم دونوں بھائیوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم دونوں بھائی اس انداز سے زندگیاں گزاریں گے کہ دنیا یہ کہے کہ ہاں حکیم عبدالحمید اور حکیم محمد سعید مثالی بھائی ہیں جن کی باہم محبت دنیا کی ہر چیز سے زیادہ وزن رکھتی ہے۔ ہم نے اپنے فیصلے کو حقیقت کا رنگ دے دیا ہے۔ ہم دو بھائیوں کے مابین محبت کے سامنے دنیا کی ہر چیز ہیچ ہے۔

تین "ز" یعنی زر، زمین، زن

نفسیاتِ انسانی کے ماہرین نے ایک خلاصۂ زندگی یہ تیار کیا ہے کہ معاشرۂ انسانی پر تین "ز" حاوی رہتے ہیں۔ یعنی "زر، زمین، زن۔" کوئی انسانی سوسائٹی تین "ز" کے اثرات سے خالی نہیں رہی ہے۔ اکثر وبیشتر انقلاباتِ زمانہ تین "ز" کی کہانیاں ہیں۔ ہم دو مثالی بھائیوں نے سب سے پہلے یہی کام کیا کہ اپنی زندگی سے تین "ز" کو خارج کردیا۔

مثالیں تو متعدد ہیں مگر میرے نونہالو! میں دو تین مثالیں پیش کرتا ہوں۔ تم ان پر ضرور غور کرو۔

میں ابھی دس گیارہ سال ہی کا تھا کہ میرے بھائی جان نے دہلی میں ایک جائیداد خریدی۔ اس جائیداد کو انھوں نے اپنے نام کرلیا۔ میری زندگی کا یہ وہ زمانہ تھا کہ میں جائیداد (زمین) کی اہمیت اور ضرورت سے واقف نہیں تھا۔ میرے ایک عزیز نے (جن کا نام لینا مناسب نہیں ہے) مجھے یہ سبق پڑھایا کہ تم دو بھائی ہو، جائیداد تمھارے نام بھی ہونا چاہیے تھی۔ حمید صاحب نے اتنی بڑی جائیداد اپنے نام کرلی ہے۔ تمھارا حق مار لیا ہے۔

میں نے بھولے پن میں یہی بات اپنی والدۂ محترمہ (رابعہ بیگم صاحبہ) سے کہہ دی۔ وہ خاموش ہوگئیں۔ میں نے جو بات کہی تھی خود میں اس کی اہمیت سے واقف نہیں تھا۔

کوئی ایک ماہ بعد معلوم ہوا کہ بھائی جان محترم نے خریدی ہوئی جائیداد فروخت کردی ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ اس رقم سے دوسری کئی جائیدادیں خریدی گئی ہیں۔ اچھا، اب معلوم ہوا کہ یہ تمام جائیدادیں بھائی جان نے اپنے چھوٹے بھائی محمد سعید کے نام کردی ہیں۔ بات لمبی ہے۔ مختصر یہ کہ میری والدہ محترمہ نے میری معصوم بات بھائی جان تک پہنچا دی اور بھائی جان نے ایک مثالی بھائی کا کردار ادا کیا اور اپنا حق (زمین) چھوڑ دیا اور سارا حق مجھے دے دیا۔

اس طرح عزیز نونہالو! ایک بھائی نے دوسرے بھائی کی محبت و تربیت کے لیے زندگی سے ایک "ز" کو خارج کردیا۔ ایثار کی یہ سب سے پہلی مثال ہے۔ پھر جب پاکستان

بنا اور میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تو معلوم ہوا کہ بہت ساری جائیداد میرے ہی نام ہے۔ میں نے اپنی ساری جائیداد اپنے بھائی کے نام کردی اور پھر میرے عظیم بھائی نے اس جائیداد کا کوئی ایک حصہ بھی اپنے نام نہ رکھا۔ اس سے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز بنادی اور اسے قوم کے نام کردیا۔

دوسرا ''ز''

جب میں نے اپنے شفیق بھائی جان کے زیر ہدایت و تربیت طبیہ کالج سے طبیب (حکیم) کی سند حاصل کرلی تو بھائی جان محترم نے ہمدرد کا تمام کاروبار اور اس کے انتظامات میرے سپرد کردیے اور پھر تمام زر و سرمایہ میرے حوالے کردیا۔ میں سب کا مالک بنادیا گیا۔ میں زر و جواہر میں کھیلنے لگا۔

پاکستان بننے سے پہلے جب پاکستان کا کوئی تصور نہ تھا ہم دونوں بھائیوں اور ہماری عظیم والدہ نے یہ فیصلہ کیا کہ اب ہم تمام کاروبار ہمدرد کو اللہ تعالیٰ کے نام وقف کردیں یعنی اپنے تمام زر و جواہر اور دولت اللہ تعالیٰ کے نام کردیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس زر و دولت کے ہم مالک تھے اسے اللہ کے نام کردیا۔ اس طرح ہم دونوں بھائیوں نے دوسری ''ز'' (زر) کو اپنی زندگی سے خارج کردیا۔

تیسرا ''ز''

اب تیسری ''ز'' زن تھی۔ ہم دونوں بھائیوں نے شادیاں کیں اور ہم نے اپنی اپنی بیویوں (زنوں) سے یہ کہہ دیا کہ اگر تم آپس میں مل کر نہ رہیں اور اگر تم نے ہم دونوں بھائیوں کے درمیان فساد کرانے کی کوئی کوشش کی تو ہم تم کو اپنی زندگی سے خارج کردیں گے یہ ہمارا قطعی فیصلہ ہے۔ اس طرح ہم دونوں بھائیوں نے اپنی زندگی سے تیسری ''ز'' یعنی زن کو خارج کردیا۔

اب کون سی چیز رہ گئی؟ ہم اس طرح مثالی بھائی بنے ہیں۔

ایثار ——— قربانیاں

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے بڑے بھائی جان نے ساری زندگی ایثار اور قربانیوں میں گزار دی ہے۔ انھوں نے میری تربیت اور میری محبت کی خاطر اپنی ہر چیز قربان کردی۔ وہ زندگی کے ہر لمحے میرے سامنے ایک نمونہ بن کر رہے اور مجھے انھوں نے انسان بنادیا۔ اب ایثار اور قربانی ان کی زندگی ہے۔ ان کا مزاج ہے۔ وہ آج بھی دوسروں کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ وہ پورے ہندستان کے لیے ایک نمونۂ ایثار اور مجسمۂ قربانی ہیں۔ آج ان کا شمار ہندستان کے ان چوٹی کے پچاس آدمیوں میں ہو رہا ہے جو ہندستان کی زندگی پر اثر انداز ہیں۔

اس وقت مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آگیا۔ مجھے کشتی چلانے کا شوق تھا۔ میں اوکھلا (دہلی) گیا اور وہاں کشتی لینی چاہی۔ کشتی والے نے ذرا بدتمیزی کی۔ مجھے غصہ آگیا اور میں نے اس کے منہ پر ایک مکا جڑ دیا۔ اس کے آگے کے دانت ٹوٹ گئے۔ اللہ توبہ! ایک مقدمہ قائم ہوگیا۔ گوڑگاؤں (دہلی سے کوسوں دور) میں عدالت میں پیشیاں ہوئیں۔ بھائی جان ان پیشیوں میں حاضر ہوتے رہے۔ وہ نہایت مصروف انسان تھے۔ عدالت میں پیشیاں ان کے لیے سوہان روح تھیں مگر وہ جاتے رہے یہاں تک کہ مقدمہ ختم ہوگیا۔ مہینوں کی پیشیوں میں ایک بار بھی ایسا نہ ہوا کہ بھائی جان نے مجھے ذرا سی بھی سزا دی ہو۔ انھوں نے سب کچھ برداشت کرلیا۔ ایک لفظ مجھ سے نہ کہا۔ جب مقدمہ ختم ہوگیا تو ایک صبح نونہالو! جانتے ہو کہ بھائی جان محترم نے مجھ سے کیا فرمایا۔ ذرا غور سے سنو۔ فرمایا:

''میاں سعید، ذرا اوکھلے کے کشتی والے کے ہاں آتے جاتے رہنا۔ اس کی مزاج پرسی کرتے رہنا۔ اس سے اپنی غلطی کی معافی بھی مانگ لینا۔''

میں نے پوری زندگی اپنے بھائی جان محترم کے ارشاد کی تعمیل کی ہے۔ میں نے ان کو آج تک ''ناں'' نہیں کہا ہے۔ اس وقت تو میں ۱۱-۱۲ سال کا تھا، سرتابی حکم کیسے کرتا۔ میں کشتی والے کے گھر جاتا رہا۔ میں نے اس سے معافی بھی مانگی۔ اس کا علاج بھی کرایا۔

دانت بھی لگوا دیے۔ وہ وقت ہے اور آج کا وقت ہے، جب اپنے آگے کے دانت صحیح سلامت دیکھتا ہوں تو مجھے شرم آ جاتی ہے۔ میں نے ایک انسان کے آگے کے دانت توڑ دیے تھے۔ آج تک میں شرمندہ ہوں۔

میرے پیارے نونہالو! میں نے تم کو چند واقعات بتا دیے ہیں۔ ایسے واقعات تو اتنے ہیں کہ کوئی گنتی نہیں۔ ۲۷ سال تربیت کا سلسلہ جاری رہا اور آج بھی (۱۹۹۰ء) ۷۱ سال کا میں ہوں اور بھائی جان محترم ۸۳ سال کے ہیں، میں ان کے سامنے آج بھی بچہ سعید ہوں۔ تربیت کا سلسلہ جاری ہے۔

اب اگر مجھے وقت مل گیا تو میں ایک کتاب تمھارے لیے ضرور لکھ دوں گا اور ساری باتیں تم کو بتا دوں گا۔ اب تم چاہو تو ان سے فائدہ اٹھا لینا۔

ایک نہایت اہم فیصلہ

میں چودہ سال کا ہو گیا۔ اس عرصے میں میں نے اچھے خاصے کارنامے انجام دیے۔ بھئی ذرا غور کرو کہ میں جب پانچ سال کا ہوا تو میں قرآن حکیم ناظرہ ختم کر چکا تھا۔ سات سال کا ہوا تو حج بیت اللہ کر آیا تھا۔ رحمان کا مہمان! تم نے نونہال ادب کی کتاب "رحمان کا مہمان" اگر نہیں پڑھی ہے تو پڑھ لینی چاہیے۔ میں اپنے حج کے واقعات اور تمام کیفیات اگر لکھوں تو واقعی داستان بڑے مزے کی ہے۔ اچھا کوشش کروں گا کہ وقت نکال کر اپنے نونہالوں کو یہ دلچسپ کہانی بھی سنا دوں۔ جب ۹ سال کا ہوا تو میں قرآن حکیم حفظ کر چکا تھا۔ گیارہ سال کا ہوا تو میں اردو، حساب، انگریزی اور جغرافیہ کے کورس پورے کر چکا تھا۔ ۱۳ سال کا ہوا تو فارسی اور عربی پڑھ چکا تھا۔ ۱۴ سال کی عمر میں بڑی بڑی کتابیں پڑھ ڈالتا تھا۔ ہاں، ایک بات ہے، میں خطرناک حد تک کھلاڑی تھا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنے پیارے نونہالوں کے لیے اپنے کھیلوں اور شرارتوں کے بارے میں ایک مختصر کتاب لکھ دوں گا۔

اب میں ۱۴ سال کا ہوا تو ایک دن بھائی جان محترم نے یاد فرمایا اور اپنے قریب بیٹھنے کو کہا۔ انھوں نے ۱۴ سال کی میری زندگی میں دو بار ایک ایک تھپڑ رسید کیا ہے۔ بڑی شرم

آتی ہے۔ بتاتے ہوئے کہ دونوں بار میرا پیشاب نکل گیا۔ اب جو طلبی ہوئی اور قریب بیٹھنے کو کہا تو بھئی میری تو جان نکل گئی۔ تھپڑ کی چوٹ سے زیادہ ڈر اس سے لگ رہا تھا کہ پیشاب ضرور خطا ہو گا، پھر کیا ہو گا۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ بھائی جان محترم کا رویہ نہایت حکیمانہ اور مشفقانہ ہو رہا تھا۔ جان میں جان آئی۔ فرمایا:

"میاں سعید! اب تم نے کھیل تو سب کھیل لیے ہیں۔ بتاؤ ارادہ کیا ہے؟ کھیلتے رہو گے یا پڑھنے لکھنے کا بھی کوئی ارادہ ہے؟"

ڈر کے مارے جان تو نکل ہی رہی تھی، مگر اس سوال پر میں خاصا حیران ہوا۔ سوچا کہ بھئی یہ قرآن حکیم کا حفظ کرنا کوئی کارنامہ نہ ہوا اور یہ اردو، انگریزی، عربی اور فارسی پڑھ لینا بھی کوئی بات نہ ہوئی۔ آخر بھائی جان محترم اور کیا چاہتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے دل میں بغاوت آئی ہے۔ بھائی جان محترم نے میرے دل میں آنے والے سوالات کو پڑھ لیا اور میری بغاوت کو جانچ لیا۔ اگلا ارشاد تھا:

"ہاں تم نے اچھا خاصا پڑھ لکھ لیا ہے اور ہاں کھیل بھی شاید ہی کوئی چھوڑا ہو۔ میں نے تم کو موٹر کار چلاتے بھی دیکھ لیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے گذشتہ سال موٹر ڈرائیونگ لائسنس بھی لے لیا ہے۔ تم کو میں نے بیلا روڈ پر موٹر سائیکل سیکھتے بھی دیکھ لیا ہے۔ میری رائے ہے کہ دنیا میں بڑا آدمی بننے کے لیے ابھی بہت کچھ پڑھنا باقی ہے۔ اس لیے پڑھائی اور کھیل اب ساتھ نہیں چل سکتے۔ اب تم کو فیصلہ کرنا ہے۔ کھیل یا تعلیم؟"

میں فٹ بال میں خاصا ماہر ہو چکا تھا۔ دہلی ینگز میں تو پہنچ گیا تھا جہاں بڑے بڑے کھلاڑی ناموری کی منزلوں سے گزر رہے تھے۔ حافظ رشید جو ہندستان کے سب سے بڑے سنٹر فارورڈ مانے گئے۔ حافظ کرامت، جن کا شہرہ یہ تھا کہ اگر حافظ رشید کا ساتھ ہو جائے تو مخالف ٹیم پر گول ہو کر رہے گا۔ عقیل اگر بیچ میدان سے کک ماریں تو مخالف گول کیپر بال سنبھال نہ سکے۔ بجن جو ہیڈ ماریں تو مخالف کے سر پر سے گزر جائے۔ میں ان ماہروں کے ساتھ کھیلتے رہنا چاہتا تھا۔ میری جان حافظ رشید تو ابھی زندہ ہیں۔ میں ان کے

ساتھ ہندستان کی سب سے بڑی فٹ بال ٹیم محمڈن اسپورٹنگ میں جانے کے تیاری کر رہا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ ہندستان کی ایک اور بڑی ٹیم موہن بگان کو ہرانے کے مزے لوٹوں اور ڈیورنڈ فٹ بال میچ میں گرین ہارورڈ (انگریز) کے خلاف کھیلنا چاہتا تھا کہ وائسرائے ہند سے انعام لے سکوں۔

بھائی جان سے میں نے کہا کہ میں کل سوچ کر جواب دوں گا۔ اس ایک دن میں میں نے بھاگ دوڑ کر کے محمڈن اسپورٹنگ کی رکنیت حاصل کر لی اور ایک دو میچوں میں شرکت کی منظوری بھی لے لی اور دوسرے دن بھائی جان سے کہہ دیا:

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ سب کھیل آج سے چھوڑتا ہوں۔ اب بس پڑھوں گا۔ لکھوں گا۔"

پھر واقعی سب کھیل یک لخت چھوڑ دیے۔ سندھ کا شطرنج چیمپئن بننے کے بعد میں آل انڈیا شطرنج چیمپئن بننے کی تیاری کر رہا تھا مگر میں نے اس کے بعد شطرنج کو ہاتھ نہیں لگایا۔ انڈیا کے کیرم چیمپئن نے کیرم بورڈ بند کر کے رکھ دیا۔

لطیفہ بھی ایک ہونا تھا

بھائی جان محترم نے مجھے طبیہ کالج دہلی میں داخل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں داخلے کے لیے لے جایا گیا۔ وہاں عمر کی قید تھی۔ ۱۶ سال سے زیادہ۔ میں تو سولہ سال سے بہت کم تھا۔ داخلے سے انکار ہو گیا۔ دل میں بڑا خوش ہوا کہ چلو ایک سال تو کھیل کے لیے مل ہی گیا۔ اب ڈیورنڈ فٹ بال میچ کھیل لوں گا۔ فرسٹ کلاس فٹ بال کھلاڑی کا نام حاصل کر لوں گا۔

مگر ہوا یہ کہ بھائی جان محترم کے اصرار پر رجسٹرار طبیہ کالج دہلی جناب محترم حکیم عبدالحفیظ صاحب سہوانی ذرا پسیج گئے۔ پھر حکیم مولوی ظہیر علی سہوانی مدد کو آئے۔ وہ بھائی جان کے دوست تھے۔ شکار میں ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔

داخلے کے لیے (ٹیسٹ) امتحان ہوا۔ بڑا بُرا ہوا کہ میں اول آ گیا، حالانکہ میں نے پرچہ جان بوجھ کر بگاڑنے کی خود کوشش کی مگر پھر بھی اول آ گیا۔

طبیہ کالج دہلی میں داخلہ ہو گیا۔ شاید میں سب سے کم عمر طالب علم تھا۔ وہاں پڑھائی شروع ہو گئی۔ کھیل سب ختم ہو گئے۔ میں گھر میں آ کر اب بھی بڑی حسرت سے مانجھے کی چرخی کو دیکھا کرتا تھا۔ بیڈمنٹن کے ریکٹ کیل پر ٹنگے ہوئے دیکھ کر دل میں ہوک اٹھتی تھی۔ گھر سے باہر جاتا تو میری چہیتا گھوڑا موتی آنکھوں آنکھوں میں پوچھتا تھا کہ صاحب اب میری سواری کیوں نہیں فرماتے۔ موٹر سائیکل جو کبھی لونگ جمپ کے کام آتی تھی اب میں اس پر سوار ہو کر اور اپنی کتابیں اس پر سوار کر کے طبیہ کالج جایا کرتا تھا۔

ہم دونوں بھائی

آج ہم دونوں بھائی صبح سے شام تک ساتھ بیٹھے رہے۔ بہت سے صنعتی مسائل جمع ہو گئے۔ روح افزا موضوع غور و فکر رہا۔ صافی کے ایکس ٹریکشن پر سوچ بچار ہوتا رہا۔ سنکارا کے فارمولے پر تبادلہ خیال ہوا۔ شام کی نشست میں خاندانی مسائل پر باتیں ہوئیں۔

رات خاندان کے بہت سے افراد کھانے پر جمع ہو گئے۔ نہایت لذیذ کھانا ہماری بھانجی مسعودہ معید نے پکایا تھا۔ خالہ زادہ بھائی خالق ہمبرگ (جرمنی) میں رہتے تھے۔ ان کی جرمن اہلیہ کی بیٹی بھی یہاں ہیں۔ خاندانی کھانا رات ۱۰ بجے ختم ہوا۔ اس کھانے کی فلم میرے پیارے بھتیجے حماد احمد بناتے رہے۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو فلم تیار تھی۔ ہم سب نے یہ فلم مزے لے کر دیکھی۔

۲۴ جولائی ۱۹۹۰ء منگل۔ دہلی

صبح چار بجے آنکھ کھل گئی۔ پاکستان میں اس وقت صبح کے ساڑھے تین بجے تھے۔ میرے دماغ میں بیدار ہونے کا وقت لکھا گیا ہے۔ جب وقت کی رفتار اس مرحلے پر آتی ہے، دماغ میری آنکھیں کھول دیتا ہے۔ ہر انسان جب چاہے اس پر قدرت حاصل کر سکتا ہے۔ اکثر نونہال مجھے خط لکھ کر پوچھتے ہیں کہ وہ اپنا حافظہ کیسے تیز کریں۔ میں ان کو جواب دیتا ہوں کہ اپنے حافظے کو حفظ کرنا سکھا دیں۔ حافظہ خود بخود تیز ہو جائے گا۔ مسئلہ در حقیقت



یہ ہے کہ آپ اپنی بات اپنے حافظے میں کس قدر گہرائی کے ساتھ جماتے ہیں۔ بات جس قدر گہرائی میں جائے گی اسی قدر وہ یاد رکھی جائے گی۔ دل سے جو بات محسوس کی جائے اور شوق سے جو چیز محسوس کی جائے، حافظہ اسے اپنی گہرائیوں میں لے جاتا ہے اور جب حافظے سے کہا جائے کہ بات کو پیش کرو، وہ نہایت مستعدی کے ساتھ اسے حافظے کی گہرائیوں سے نکال کر پیش کر دیتا ہے۔ اوہو، تونہالو! میں کیا بتاؤں انسان کا دماغ نہایت پیچیدہ ہے۔ اس میں اپنے اندر باتیں جمع کرنے کی (اسٹور کرنے کی) بے پناہ صلاحیت ہے اور اس کی اب تک کوئی حد مقرر نہیں ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے اور ٹھیک کہا جاتا ہے کہ نارمل انسان اپنے دماغ کا صرف دسواں حصہ ہی استعمال کرتا ہے اور جو غیر معمولی انسان ہوتے ہیں وہ شاید ۲۰۔۲۵ فیصد دماغ کام میں لانے پر قادر ہوتے ہیں اور غیر معمولی کہلاتے ہیں۔ اب یہ انسان کی اپنی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ کس قدر اپنے دماغ کو کام میں لانے پر قادر ہوتا ہے۔